دعائے صباح : مرتبہ جناب کالی داس گپتا رضا، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۴۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ روپے

پتہ :- ناشرومل پبلیکیشنز، ۷۰، اجولی بھون نمبرا نیو مرین لائن چرچ گیٹ، بمبئی ۴۰۰۰۲۰،

مسلمانوں کے فرقہ شیعہ میں دعائے صباح کو بڑی اہمیت ومقبولیت حاصل ہے، یہ حضرت علیؓ سے منسوب ایک مشہور دعا ہے، مرزا غالب مرحوم نے اس کا منظوم فارسی ترجمہ کیا تھا جو ان کی زندگی میں ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایما سے نول کشور نے پہلی دفعہ شائع کیا تھا، یہ اڈیشن اب نادر وکمیاب تھا، مگر حسن اتفاق سے غالب کے پرستار اور اردو کے معروف ادیب وشاعر جناب کالی داس گپتا رضا کے کتب خانہ کے غالب کلکشن میں پایا گیا، اسی کو انھوں نے اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اس اڈیشن میں غالب کے منظوم فارسی ترجمہ کے ساتھ دعائے صباح کا عربی متن اور فارسی میں ایک نثری ترجمہ بھی شامل تھا، یہ سب من وعن زیر تبصرہ کتاب میں بھی آگئے ہیں، مقدمہ میں دعائے صباح کی اہمیت، غالب کے منظوم ترجمہ کی مختلف اشاعتوں اور اس کے متعلق دوسری ضروری باتوں کے علاوہ اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، جو گپتا صاحب کے خیال میں غالب کے عہد جوانی سے پہلے کی تصنیف ہونے کا نتیجہ ہیں، ان کے خیال میں فارسی کا نثری ترجمہ غالب کے علاوہ کسی اور کا ہے، مگر انھوں نے اس پر کوئی سیر حاصل بحث نہیں کی ہے۔

"ض"

.....٭.....

جلد ۱۲۴ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۹ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات سے یہ برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا بھی ایک ممتاز متکلم، ایک مضطرب متفکر، ایک دیدہ ور مفسر، ایک بے چین شارحِ دین، ایک قابلِ قدر ترجمانِ شریعت اور ایک بلند پایہ مصنف سے محروم ہو گئی،

انھوں نے ۷۶ برس کی عمر پائی، ان گنت کتابوں کے مصنف ہوئے، شروع میں اُن کی تحریریں نکلیں تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو محسوس ہونے لگا کہ ان میں وہ ساری باتیں ہیں جن کی تلاش اُن کے ذہن کو ہے، جب وہ مغربی افکار کے ابلیس کی تلبیس سے دب کر اپنے تذبذب اور تشکیک کی بنا پر اسلام کو جامد اور غیر متحرک پا رہا تھا تو اُس کو مولانا مودودی کی تحریروں کے ذریعہ سے یہ احساس ہوا کہ کوئی اس کے تاریک اور منجمد ذہن پر تلہ بول کر اس کو جھنجھوڑ رہا ہے، مولانا مودودی کی تحریروں میں شگفتگی بھی ہوتی، دلنشینی بھی، حرارتِ ایمانی کی گرمی بھی، نظر و فکر کی گرم جوشی بھی، منطقی دلائل کے یقین کی پختگی بھی، عالمانہ انداز میں کلام پاک اور حدیث کی جاندار تعبیر بھی، اسلام کے ناقدوں اور خصوصًا فرنگی معترضوں کے خلاف جارحانہ حملے بھی، اور یورپی طرزِ فکر کو جرأت مندانہ تحدی بھی، اسی لئے وہ شوق سے پڑھی گئیں، اُن کا علم ایک بحرِ زخار تھا جس سے انھوں نے بقول استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی یورپ کے ملحدانہ افکار کے خلاف ایک بند باندھنے کی کوشش کی، اس میں اُن کے قلم کی بے مثال قوت اُن کا پورا ساتھ دیتی رہی،

رفتہ رفتہ وہ ایک خاص مکتبِ فکر اور تحریک کے بانی قرار پائے جس سے صالح قیادت کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں طاقتور دینی روح، دینی اخلاص اور دینی قدریں پیدا کرنا چاہتے تھے، یہ تحریک اس برصغیر میں جماعتِ اسلامی کی تنظیموں سے مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے طبقہ پر اثر انداز ہوئی،

اُن کی مقبولیت بڑھی تو بعض حلقوں میں اُن سے اختلاف بھی پیدا ہوتا گیا، انھوں نے تصورِ دین کے سلسلہ میں الٰہ، رب، دین اور عبادت کے قرآنی کلمات اور اسلامی اصطلاحات کی جو تشریح کی یا تصوف کو تعطل اور بطالت کا جو دوسرا نام قرار دیا، یا نسلی اور اصلی مسلمان کی جو تفریق بتائی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا یا اور دوسرے صحابۂ کرام کی شان میں جو الفاظ استعمال کئے یا امام ابو حنیفہ کے بارے میں جو یہ لکھا کہ اُن کی فقہ میں بکثرت ایسے مسائل ہیں جو مرسل، معضل اور منقطع حدیثوں پر مبنی ہیں یا معیارِ حق کی جو تشریح کی الخ، الخ تو اُن کے اور اُن کے حامیوں کے کلامی افکار و نظریات پر بہت ہی تلخ بحث چھڑ گئی،

حکومتِ الٰہیہ کے تخیل کے ساتھ مولانائے مرحوم نے پاکستان کی عملی سیاست میں حصہ لیا تو اُن کو دار کے تختہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی، خود ہندوستان کے اندر اُن کے حامیوں سے حکومت کچھ ایسی مشکوک ہوتی چلی گئی کہ بات بات پر اُن کو جیل جا کر ابتلا و آزمایش سے دوچار ہونا پڑا، مگر مولانائے مرحوم نے اپنے یقینِ محکم، عملِ پیہم اور عزمِ راسخ کا وہی ثبوت دیا جو اسلام کے بڑے بڑے مصلحین نے دیا ہے، انھوں نے اپنے معتقدوں میں بھی استقامت کی ایسی روح پھونکی کہ وہ بھی ہر امتحان میں پورے اترے،

ہر نئی دعوت کے داعی اور اُس کے حامیوں کو ہر طرح کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت کے صبر آزما مرحلوں سے ہمارے مصلحین اور مجاہدین درس لیتے رہے ہیں، یہ صحیح ہے کہ اسلامی تحریک شاید ہی کوئی ایسی ہو جس کی مخالفت کسی نہ کسی طرح نہ کی گئی ہو، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ایسی ہر تحریک میں کچھ نہ کچھ نظری، فکری اور عملی خامیاں اور کمزوریاں بھی ضرور رہی ہیں، جن سے مخالفت کا موقع ملتا رہا، جن اسباب کی بنا پر اُن کی مخالفت ہوئی، ان کا گہرا تجزیہ کرنے کے بعد بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے، آخر ہم گذشتہ چودہ سو سال کی تاریخ کے اپنے عروج و زوال دونوں کے عواقب سے کب بصیرت اور عبرت حاصل کریں گے، موجودہ دور کے مسلمانوں کو بھی اپنے معاشرہ میں مذہبی، معاشرتی، اور سیاسی انحطاط و ادبار کا سامنا ہے، وہ بے چینی سے متوقع ہیں کہ اس کو دور کرنے کے لئے اُن کے مفکرین اپنی اسلامی

نظر و فکر سے کچھ ایسی قابلِ عمل چیزیں پیش کریں جو متنازعہ فیہ ہونے کے بجائے متفق علیہ ہوں، یا کم از کم اس حد تک قابلِ قبول ہوں کہ اُن کے خلاف کفر و ضلالت کا فتویٰ صادر نہ کیا جائے کیا یہ ممکن نہیں؟ اگر ناممکن ہے تو سارے مسلمان اپنے خیالات کی ریت میں اپنے ذہن کو یہ سوچ کر چھپالیں کہ انسانی تاریخ میں آج تک کوئی ایسی تحریک نہیں چلی جس کی مخالفت نہ ہوئی ہو، مگر یہ اسلامی طرزِ فکر نہیں، ہر اسلامی تحریک کے دردمند اور مخلص محرک کو یہ سوچنا ضروری ہے کہ اس سے مسلمانوں کی یکجہتی اور یکانگت میں خلل پڑنے کا ذرا بھی احتمال ہو تو وہ اس تحریک کی خامیوں کو یا تو دور کرے یا اس سے دست بردار ہو جائے، ایک اسلامی قائد کی شان یہ ہے کہ اس کی کسی بات سے کسی مسلمان کے تلوے میں چبھن محسوس ہو تو وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس کرے،

اس قسم کی بحث ہوتی رہے گی مگر اب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی وہاں ہیں جہاں ان سے پہلے اسلام کے بڑے بڑے مفکرین جا چکے ہیں، وہ اپنے پیچھے اپنی نظر و فکر کا ایک خزانہ چھوڑ گئے، مگر اپنے ساتھ اسلام کی وہ شیریں دیوانگی لے گئے ہیں، جس میں وہ زندگی بھر مبتلا رہے، اُن کی تحریروں میں کہیں کہیں اسلام کی جو لپسی ہوئی بجلیاں اور بکھری ہوئی تجلیاں ہیں وہ انکے آخری سفر کی زادِ راہ ہیں وہ مضطرب اور بے قرار گھڑیاں جو انھوں نے اپنے مطمحِ نظر سے احیائے دین کی خاطر اپنی زندگی میں گذاریں، کیا عجب کہ عالمِ بالا میں رحمتِ الٰہی کے موتیوں کی لڑیاں بن جائیں، اُن کا جنازہ دھوم سے اٹھا، بے شمار لوگوں نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھی، علما، صلحا، اتقیا، اور اصفیا نے اُن کا ماتم کیا، دعا ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں بھی اُن کو یہی حسنِ قبول عطا ہو، آمین ثمّ آمین، اللّٰھُمّ اغفر لہ وارحمہ،

……

مقالات

مطالعۂ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کے مبادیات

(خواجگانِ چشت کے ملفوظات کی روشنی میں)

از مولانا اخلاق حسین دہلوی بستی نظام الدین دہلی

(۳)

یہ بحث ذرا طویل ہو رہی ہے لیکن یہ موضوع کچھ ایسا اہم ہے کہ بعض تنقید نگاروں کی بیجا تنقیدوں سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیا جائے، ناظرین سے اس بحث کی طوالت کے لئے معذرت خواہ ہیں،

خوارقِ عادات | انسان اگر غور و فکر سے کام لے تو یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی کہ دنیا کی ہر شے عجائبات کا مرقع ہے، بلکہ وہ خود عجائبات کا مجموعہ ہے، بہر حال ایسے واقعات جو عام حالات سے مختلف، حیرت انگیز، عقل و فہم سے بالاتر ہوتے اور گاہ بگاہ ظہور میں آتے ہیں، انھیں خوارقِ عادات سے تعبیر کیا جاتا ہے، انجن کی ایجاد پر جارج اسٹفنسن کے خلاف مذہبی پیشواؤں نے جو فتوے دیئے تھے، تاریخ آج بھی انھیں دہرا رہی ہے، بجلی، ٹیلیفون، وائرلیس، ریڈیو، ٹیلی وژن سب ہی حیرت انگیز ہیں لیکن رواج عام نے اُن کی حیرت

واستعجاب کو زائل کر دیا ہے، اور وہ تمدن کا لازمہ بن گئے ہیں، اور روزمرّہ کی چیزوں میں شمار ہونے لگے ہیں، ورنہ غیر شایستہ اذہان نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے،

اسلامی اذہان نے خوارقِ عادات کی تین نوعیتیں قرار دی ہیں (۱) جو محیر العقول واقعات انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتے ہیں، انھیں معجزہ کہتے ہیں (۲) جو مافوق الفطرت امور ارادۃً یا بلا ارادہ اولیاء اللہ سے ظہور میں آتے ہیں، انھیں کرامت سے تعبیر کرتے ہیں (۳) اور جو ان اشخاص سے ظہور میں آتے ہیں جو کسی مذہب سے رابطہ رکھتے ہی نہیں یا برائے نام رکھتے ہیں یا جن پر بے دین ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے، اسے استدراج کہتے ہیں، حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا ارشاد ہے،

آنچہ درو عقل را گنجایش نباشد	جس میں عقل کو دخل نہیں
آن کرامت است،	وہ کرامت ہے،

(فوائد الفواد ص ۷)

یہ اسی روایت سے متعلق ہے، جو لفظی اختلاف کے ساتھ فوائد السالکین (ص ۱۲) میں ہے، لفظی اختلاف کی امثلہ "علم مجلسی سے آگاہی" کے زیر عنوان گذر چکی ہیں، اس روایت سے متعلق اردو میں عہدِ حاضر کے ایک تنقید نگار نے لکھا ہے:

"ایسے واقعات کی بھرمار ہے، جو چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں، فوق العادہ عنصر کی بھی کمی نہیں، اور خوارق کے بیان میں مبالغہ ہے"

(منادی دہلی ص ۸۶، بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۵-۴-۵-۶، ۱۹۷۴ء)

کیا تنقید نگار کو چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات سے آگاہی کے باب میں حضرت

محبوبِ الٰہیؒ پر فوقیت ہے، جو کمالِ علم و عمل کے باوجود اس سے آگاہ نہ تھے کہ یہ روایت چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے،

سلوک را صد مرتبہ نہادہ اند مقدم	سلوک کے لئے سَو درجات رکھے ہیں
مرتبہ کشف و کرامت است، اگر	ستر ہواں درجہ کرامت کا ہے اگر
سالک ہمدریں مرتبہ باند ہشتاد	سالک اسی درجہ میں رہ گیا تو وہ بقیہ
وسہ دیگر کے برسد،	تراسی درجات کو کیسے پہنچے گا،

(فوائد الفواد ص ۱۷)

بیان کا اسلوب منھ سے پڑا بول رہا ہے کہ جب تک مدارج سلوک کی تکمیل نہ ہو جائے، اظہار کشف و کرامت میں محتاط رہنا چاہئے، البتہ تکمیل کے بعد ضرورۃً وارادۃً کشف و کرامت سے کام لیا جا سکتا ہے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ارشاد ہے:

چوں صد مرتبہ ہم طے کند، آں	(فوائد السالکین ص ۲۰)	جب سواں مرتبہ بھی طے کرے
گاہ ہر چہ خواہد کشف کند....		پھر جو چاہے ظاہر کرے......
.... مرد کامل آنست کہ خود را تا		......، مرد کامل وہی ہے جو اس
آں زماں کشف نہ کند، تا تمام		وقت تک اپنے کو ظاہر نہ کرے جب
حاصل نہ کند،		تک تکمیل نہ کرلے،

فوائد الفواد ہو یا دیگر مجموعۂ ملفوظات ان سب میں ان ہی بزرگوں کی کرامات کا ذکر ہے، جو درجۂ کمال کو پہنچ چکے تھے، اور اگرچہ فوائد الفواد میں بھی خوارق عادات اور کرامات کا ذکر ہے، اور بکثرت ہے لیکن اسرار الاولیاء، اور راحت القلوب کے جامعین کو منصب

سجادگی تفویض ہوناتھا اسلئے اُن کی ترتیب میں منصب کی رعایت کوبھی دخل ہے، اس اعتبار سے ان تینوں کتابوں میں وہ امتیاز ہے جو ہوسکتا ہے،

تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں ہندوستانی اذہان جوگیوں اور سنیاسیوں کے دامِ فریب میں پھنسے ہوئے تھے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے عہدِ شیخوخت میں وہ کیفیت نہیں رہی تھی، اس لئے جو کچھ ان دونوں حضرات کی تربیت کے لئے درکار تھا، وہ ہرگز کسی اعتبار سے بھی خواجہ امیر حسن علا سجزی کی تربیت کے لئے نہ تو درکار تھا، اور نہ ہوسکتا تھا، فوائد الفواد میں وہ کچھ تلاش کرنا جو اسرار الاولیاء اور راحت القلوب میں ہے، تلاش بے محل اور سعی لاحاصل ہے، بہرحال جن نفوسِ زکیہ کو اصلاحِ قوم کی خدمت تفویض کرنی ہوتی ہے، اُن کی تربیت عام تربیت سے ممیز ہوتی اور ہوسکتی ہے، حضرت امیر خسروؒ اور قاضی محی الدین کاشانیؒ کی تربیت کا امتیاز اس کی روشن دلیل ہے، لہٰذا ان نفوسِ زکیہ کو ماحولی کیفیت سے اور منزل کے نشیب و فراز سے آگاہی بخشنا تربیت کا لازمہ ہے، اور اگرچہ ان ملفوظات میں آپ بیتی کے اُبھرتے ہوئے نقوش شاذو نادر ہی ملتے ہیں تاہم آپ بیتی کے موثر انداز میں واقعات کو دلنشیں کرنا بھی مناسب ہوتا ہے جس سے استعداد عمل کو مہمیز ہوتی ہے، اور دل و دماغ آمادہ عمل ہو جاتے ہیں، ماحول کی کیفیات کو نظرانداز کر کے جو بھی جائزہ لیا جائے گا، غلط ہوگا، خواجہ حالی نے لکھا ہے،

"سوپر نیچرل یعنی ما فوق العادۃ باتیں اور عجیب و غریب قصے ... جن سے قدیم اور متوسط زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہوا ہے"

(حیاتِ سعدی ص ۱۲۵)

پھر ملفوظات جو عہدِ وسطیٰ ہی کا تہذیبی و روحانی سرمایہ ہے، اس میں ما فوق العادۃ عنصر کا نہ ہونا اُن کی خامی تو ہوسکتی ہے، خوبی نہیں ہوسکتی، خصوصاً اس لئے کہ ان بزرگوں کو

ان سے دوچار رہنا بھی پڑتا تھا، اور اگرچہ کتب ملفوظات ہم تک کامل صحت کے ساتھ نہیں پہنچ سکی ہیں، اور اکثر چند منتشر اوراق کا مجموعہ رہ گئی ہیں، تاہم ان میں جو کچھ ہے، وہ بہت کچھ اپنے موضوع سے متعلق ہے، علمی مسائل کا بیان اور احکام کا درس متعلق ہوتا ہو روحانی نظام سے تربیت گاہوں کا نظام اپنا مقام آپ رکھتا ہے،

ع : ہر سخن محلے و ہر نکتہ مقامے دارد

صوفیائے کرام طبیب روحانی ہوتے ہیں، قلوب کی نبض پر اُن کی انگلیاں، اور دل کی تہہ میں اُن کی نظریں ہوتی ہیں، وہ جو کچھ مناسب سمجھتے ہیں، تجویز کرتے ہیں، کلامنا اشارۃ سمجھنے کے لئے اہلیت درکار ہے، جو آج عنقا ہے، پھر یہ کہنا گیا ہے:-

"اکثر بزرگوں کے فوق الفطرۃ تصرفات اور خوارق عادات کا مبالغہ آمیز بیان ہے، سب سے زیادہ شبہ پیدا کرنے والا حصہ وہ ہے، جس میں صاحب ملفوظ خود اپنی کرامت بیان کرتا ہے"

(منادی دہلی ص ۱۹۳، جلد ۴۹- شمارہ ۴-۵-۶ سنہ ۱۹۷۴ء)

اولیاء اللہ جن کی زندگیاں اوصافِ حمیدہ سے متجلی اور رذائل سے مبرا ہوتی ہیں، اگر ضرورۃً شاذ و نادر آپ بیتی اُن کی زبان پر آگئی ہے، تو وہ خودستائی اور خودنمائی نہیں حالات کا اقتضا رہے، خواجہ حالی نے سوپر نیچرل کی پینگ بڑھائی تھی، انھوں نے اپنے عہد کے خیالات کی وادیوں میں بھٹکنے والے شاعروں کو متنبہ کیا تھا، اور عملی زندگی کی ترجمانی کی ترغیب دی تھی، جس کی ضرورت تھی، ان کی تحریک سے اُردو شاعری نے کروٹ بدلی اور قومی و ملی باکمال شاعر منصۂ شہود پر آئے، مگر سات آٹھ سو برس قدیم صوفیانہ ادب کو ہدفِ ملامت بنانے کا کیا محل ہے، اور اس سے کونسی منفعت مقصود ہے،

بلا شبہ ہندوستان کے اکابر چشتیہ کے ملفوظات میں محیر العقول اور مافوق العادۃ عناصر کی آمیزش ہے، جو اس عہد کا تمنائے امتیاز ہے، صوفیانہ ادب نہ اس سے خالی ہے، نہ ہونا چاہئے جو کچھ اس میں ہے وہ ہدایت و رشد کے روشن مینارے ہیں، جن کی تابانی آج بھی جلوہ ریز ہے انھیں ہدفِ تنقید بنانا درست نہیں ہے،

عجائب الاسفار | عہدِ ماضی میں جن سیاحوں نے بری و بحری سفر کئے ہیں، اُن کے سفرنامے شاہد ہیں کہ انھیں عجائباتِ روزگار سے دوچار ہونا پڑا ہے، مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے کا نام ہی عجائب الاسفار رکھا ہے، اس کی ملاقات متعدد ایسے اشخاص سے ہوئی تھی، جو حیرت انگیز شخصیتوں کے مالک تھے، اور خوارق العادۃ اُن سے ظہور میں آتے تھے، ابنِ بطوطہ اس عہد میں ہندوستان آیا تھا جب خوارق کا زور ٹوٹ چکا تھا، اور برائے نام ان کا وجود رہ گیا تھا تاہم ابنِ بطوطہ کے سفرنامہ کے اس حصہ میں جو سفر ہندوستان سے متعلق ہے، متعدد محیر العقول واقعات ملتے ہیں، مگر اس بنا پر آج تک نہ کسی نے اس کو غیر اہم قرار دیا اور نہ جعلی بتایا،

صوفیاے کرام جو بذات خود محیر العقول اوصاف کے مالک ہوتے ہیں، اور اصلاحِ حال کے پیش نظر ہر رکاوٹ کو ٹھکرا دینے کا منصب رکھتے ہیں، اور انسان کو انسانیت کے وصف سے متصف کرنے میں لگے رہتے ہیں، اگر ماحول کی ضرورت سے خرق عادت سے کام لیتے ہیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے، یہ اس عہد کا لازمہ ہے، جس کو عہد ماضی کے تمدن کا مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا، عہد حاضر میں تنقیدی جائزے جو ملفوظات سے متعلق شائع ہوئے ہیں، اور میرے مطالعہ میں آئے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں، اس اجمال کی تفصیل ان مضامین میں ملے گی جو کتب ملفوظات میں لکھے گئے ہیں، اور لکھے جائیں گے،

کتابیات | کتب ملفوظات میں اس عہد کی متعدد کتابوں کے نام آئے ہیں، جن میں سے بہت سی اب ناپید ہیں، شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا میں آخذ کی طویل فہرست درج ہے، اس میں ایسی کتابوں اور رسالوں کے نام بھی ہیں، جو اس عہد کے اہلِ قلم نے شاید ہی دیکھے اور سُنے ہوں، یہ فہرست ڈیڑھ پونے دو سو کتب و رسائل کے اسماء پر مشتمل ہے، کتب ملفوظات جو ہدفِ تنقید ہیں، ان میں سے جس کتاب میں سب سے زیادہ تعداد ہے، وہ چونتیس ۳۴ ہے، تعجب ہے کہ تنقید نگار اس مختصر تعداد کے بارہ میں بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ

"اتنی کتابوں سے جامع نے شاید ہی استفادہ کیا ہو ان میں سے اکثر فرضی ہیں"

(منادی دہلی ص ۱۶۶ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۴ء)

یہ دو ہی جملے ہیں جو باہم متضاد ہیں حالانکہ جامع ملفوظات کا کام صرف ملفوظات کا جمع کرنا ہے اس کیلئے ان کتابوں سے استفادہ ضروری نہیں جن کا ذکر ملفوظات میں آیا ہے خواہ اس کا مطالعہ کیسا ہی وسیع کیوں نہ ہو، جن کتابوں کے نام کتب ملفوظات کی زینت ہیں، وہ فرضی نہیں واقعی ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کے نام کتبِ قدیمہ میں ملتے ہیں انکو فرضی تصور کرنا اپنی لاعلمی کا ثبوت دینا ہے،

تاریخی قدریں | کسی واقعہ کا تاریخ سے وابستہ ہونا اور تاریخی اندراج کا صحیح ہونا بلا شبہہ واقعہ کو تقویت بخشتا ہے، اہلِ علم انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ تاریخ میں متعدد واقعات مختلف فیہ ہوتے ہیں، اور تاریخی اندراجات بھی مختلف ہوتے ہیں، لیکن تاریخی اختلاف کی بنا پر کسی واقعہ سے اور نفسِ واقعہ سے انکار نہیں کیا جاتا، بلکہ صحت کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے،

کتب ملفوظات میں سے اگر کسی نسخے میں واقعہ کے ساتھ سنہ اور تاریخ وغیرہ صحیح نہیں ہے تو تصحیح کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، واقعہ کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے یہ علمی

و تحقیقی نقطۂ نظر ہے، جو علمی دنیا میں مروج ہے، غلط تاریخی اندراج کی بنا پر کسی کتاب کو جعلی قرار نہیں دیا جاسکتا، اگر صحت کا نقطۂ نظر یہی قرار پائے، تو ملفوظات ہی کیا بہت بڑا علمی ذخیرہ جعلی قرار پائے گا، اس لئے اہلِ علم و اہلِ نظر اس روش پر کارفرما نہیں ہیں،

ملفوظات سے دلچسپی رکھنے والے خاص ہوں یا عام معدودے چند کے سوا تاریخی قدروں سے دلچسپی نہیں رکھتے، اُن کے دل و دماغ نفس واقعہ سے متاثر اور کیف اندوز ہوتے ہیں اور ہدایت کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں، انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کوئی واقعہ کب ہوا، کس دن ہوا، کس تاریخ کو ہوا، کس مہینہ میں ہوا، اور کس سنہ میں پیش آیا، یہ سوال اٹھتا ہی نہیں ہے، اُن کے دل و دماغ روحِ واقعہ سے متعلق رہتے ہیں،

بلاشبہ تاریخی صحت نہایت کارآمد اور مفید ہے، خصوصًا اُن کے لئے جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں، اصلاح کی طرف متوجہ ہوسکتے ہیں، اور صحت مند معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں، لیکن جن کتابوں کا وجود صد ہا سال سے پایا جاتا ہے، ان میں اگر کسی تاریخی واقعہ میں سقم پایا جائے، تو اُن کو جعلی قرار دینا صحیح نہیں، یہ بھی کوئی اصول نہیں کہ اگر کسی کتاب کا کوئی قدیم ترین نسخہ دستیاب نہ ہوسکے، یا متداول کتابوں میں اس کا ذکر نہ ملے تو اس کے وجود ہی سے انکار کردیا جائے، اگر یہی اصول ہے تو دررِ نظامی کے وجود سے سب سے پہلے انکار کیا جائے گا جس کا قدیم ترین نسخہ جو دستیاب ہوا ہے، وہ قیاسًا بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، اور کہیں کہیں معلومات بھی مشتبہ ہیں، جس سے یہ بھی یقین ہوتا ہے، کہ دررِ نظامی بھی الحاق و تحریف سے محفوظ نہیں ہے، حالانکہ تنقید نگار کے نزدیک دررِ نظامی کا شمار نہایت درجہ مستند کتابوں میں ہے،

بہرحال کتب ملفوظات جو ہم تک پہنچی ہیں، وہ داخلی دلچسپی کی بدولت پہنچی ہیں،

جس میں بلاامتیاز عقیدت مندوں کی دلچسپی کو دخل ہے، علماء کی دلچسپی کے نقوش خال خال ملتے ہیں، غالبًا اس لئے کہ ان میں درسِ عمل ہے، اور عالمانہ قیل و قال نام کو نہیں ہے، بہرحال ہم ان عقیدتمندوں کی دلچسپی کے مرہونِ منت ہیں، جن کی بدولت ہم اپنے قدیم روحانی اور تہذیبی سرمایہ سے فیض یاب ہیں،

ان حالات میں تاریخی قدروں کا برقرار رہنا کچھ یقینی نہیں لہذا ان کے درپے ہونا معقولیت سے بعید ہے، البتہ صحت کی جانب توجہ کی جاسکتی ہے، اور یہ ایک اچھی کوشش ہوگی،

ملفوظات کی مقبولیت

ملفوظات میں کچھ ایسی جاذبیت اور کشش ہے، کہ گوناگوں خامیوں کے باوجود پڑھنے اور سننے والے ان سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتے ہیں، بسا اوقات وہ عالمِ کیف و سرور میں کھو سے جاتے ہیں، ان کا دل وہ جگہ چاہتا ہے، جہاں نور و سرور ہی ہو، اور کچھ نہ ہو، ان سے ان کی روح کو ایسی طمانیت نصیب ہوتی ہے، جو کسی نعمت سے کم نہیں، وہ اللہ کے سوا سب کچھ بھول جاتے ہیں، انھیں اپنے حال پر ندامت ہوتی ہے، اصلاحِ حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، انھیں ہدایت نصیب ہوتی ہے، اور نور و سرور بھی، مجھے دراصل ملفوظات ہی نے مسلمان بنایا، اور بنائے رکھا ہے، اس مادی دور میں ملفوظات کی یہ تاثیر حیرت انگیز ہے، مگر

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت محبوب الٰہیؒ کی مجلس میں بسبیل تذکرہ ایک صاحب نے بیان کیا کہ ایک صاحب تھے جو صلاحیت بھی رکھتے تھے، اور درویشوں کی خدمت بھی خوب کیا کرتے تھے، ایک دن میں نے اُن سے کہا کہ آپ ہمارے حضرت سے بیعت کیوں نہیں ہوجاتے تم انھوں نے کہا

کہ ایک دن بیعت ہونے کے ارادے سے گیا تھا، مگر کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں خوان پوش ہی خوان پوش جمع ہیں، اور شعلیں روشن ہیں، یہ منظر دیکھ کر مجھے عقیدت نہیں رہی، میں چلا آیا، حضرت محبوب الٰہیؒ نے حاضرین مجلس کی طرف رُخ کیا، اور فرمایا کہ یہاں خوان اور شعلیں کب تھیں، پھر مسکرائے اور فرمایا، یہ نعمت مقدر میں نہ تھی، تو یہ کچھ دکھا دیا، (فوائد ص ۲۵)

ایک زمانہ تھا کہ عام وخاص کو ملفوظات کے پڑھنے اور سننے میں بڑا ہی شغف تھا، خواندہ اشخاص کو اپنی مشغولیت سے جب وقت ملتا، تو مطالعہ کرتے ہی تھے، خواص کے ہاں رات کو جو نشست ہوتی تھی، اس میں بھی اولیاء اللہ کا ذکر رہتا تھا، ان میں شریک ہونے والوں کے دلوں میں اللہ کی یاد تھی،

میرے بچپن میں دلی کے کارخانہ داروں کا دستور یہ تھا، کہ وہ جاڑوں کی راتوں میں مل بیٹھتے، کارخانے ہی میں جمع ہو جاتے، نوجوان ہوتے تو قصے کہانیاں ہوتیں، قصۂ چہار درویش پڑھا اور سنا جاتا، بوڑھے بزرگ اور سن رسیدہ ہوتے تو کسی سے ملفوظات پڑھواتے، سنتے اور سنواتے، گاہ بگاہ میں بھی پکڑا میں آجاتا تھا، اگر پڑھنے والا نہ ملتا تو کوئی بزرگ خود بیان کرتے، سنتے سنتے انھیں بھی واقعات ازبر ہوتے تھے، مزے لے لے کے خوب سناتے تھے، کوئی شوخ کہہ بھی بیٹھتا استاد، تو اچھے خاصے مولوی ہیں، وعظ بھی کہیں تو جچ جائے، پھر احوال افکار دنیا سے دم بھر کے لئے چھٹکارا مل جاتا، اور انھیں ایسا لگتا کہ وہ نور کی دنیا میں آبیٹھے ہیں، بے ساختہ کہہ اٹھتے ؎

نور کی دنیا میں اب رہتے ہیں ہم — دل کے ہاتوں منزلت پائی بہت

یہ ذوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان پڑھ بھی اچھے خوشنویسوں سے ملفوظات نقل کراتے، سنہری روپہلی جدولیں بنواتے، خوشنما چرمی جلدیں بندھواتے، ان پر بھی رنگ برنگی گلکاری کراتے،

جزدانوں میں رکھتے، اور بڑے احترام سے رکھتے اور پڑھتے تھے، لوبان کی دھونی دیتے، کوئی نامی گرامی عالم یا ایسا ہی کوئی پڑھا لکھا آنکلتا تو اسے اپنے گھر یا اپنے کارخانے میں لیجاتے، عزت سے بٹھاتے، آؤ بھگت کرتے، اور بڑے فخر سے وہ مجموعۂ ملفوظات اسے دکھاتے، جب وہ حروف کی نوک پلک، کشش و دوائر کی تعریف کرتے تو مجھے حیرت ہوتی، یہ تو ان پڑھ ہیں، میں ہی نہیں جانتا، انھیں آگاہی کیسے ہوئی، میں دیکھتا، اور غور سے دیکھتا اور سنتا، کہ کس کس کی کیا تعریف کر رہے ہیں، حیران رہ جاتا، بدل کیا سکتا تھا، ان آنکھوں نے ایسے ایسے خوش عقیدہ دیکھے ہیں، جن کی یاد سے آج بھی روح میں اہتزاز پیدا ہوتا اور جی بھر آتا ہے، اللہ پاک اُن کی مغفرت فرمائیں، اور اُن کے صدقے میں ہماری بھی،

والد مرحوم کا معمول

والد مرحوم حر (سید محمد ابراہیم حسنی حسینی) نہ تو سجادہ نشین تھے نہ کسی درگاہ کے خادم و مجاور، اُن کا تعلق محنت کش طبقہ سے تھا، البتہ صاحبِ ذوق اور صاحبِ نسبت تھے، مجاز بھی تھے، مگر پیری و مریدی پیشہ نہ تھا، علماء، صوفیہ، اور شرفاء غرض کہ عوام وخواص سب ہی سے میل جول تھا،

ع: دل بیار و دست بکار

رہا عمل تھا، ان کا معمول یہ تھا کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ مردانہ میں افطار کیا کرتے تھے، عصر کے بعد سے معمولاً ملفوظات کا مطالعہ فرماتے، رفتہ رفتہ احباب آ جمع ہوتے تو آواز سے پڑھنے لگتے، ورنہ خاموش مطالعہ فرماتے رہتے تھے،

عجب سماں ہوتا تھا، رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ، عصر و مغرب کا درمیانی وقت، روزے کا کیف، روح میں تازگی اور بالیدگی، ایسا لگتا تھا کہ یہ فرشتے ہیں، یا نور کے پتلے، چہروں پر معصومیت اور نورانیت، ایسے بیٹھے سنتے، جیسے ہے ہی نہیں، مجلس سنسان، ہو کا میدان ہے،

گاہ بگاہ گریہ طاری ہو جاتا، یا آنسو ڈبڈبا آتے، دل کا کیا عالم ہوگا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، یا کچھ وہی جانتے ہوں گے، اللہ سے لو لگی ہوتی اور زبان پر اللہ اللہ ہوتا کبھی کبھی درد بھری آہ بھی سینے میں آ جاتی، میں بیٹھا منھ تکتا رہتا، اور زبانِ حال سے کچھ کہتا سنائی دیتا ہے،

بکن پنبۂ غفلت از گوشِ ہوش
کہ از مردگاں پندت آید بگوش

میری آنکھوں نے سالہا سال یہ سماں دیکھا ہے، ملفوظات سے مجھے جو انسیت ہے، وہ مجھے ورثہ میں ملی ہے، مان لیجئے گھٹی میں پڑی ہے،

عہدِ حاضر میں ہند و پاک کے تنقید نگار ملفوظات پر جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ تنقیدیں نہیں تنقیصیں معلوم ہوتی ہیں، بارگاہِ الٰہی میں میری التجا ہے کہ تخریب سے یہ لوگ درگذریں اور تعمیر میں لگ جائیں،

ملفوظات ہماری تہذیب و ثقافت کا گراں قدر سرمایہ ہے، جو اب بھی ہمارے لئے سرچشمہ ہے، اس سرمایہ کا ضائع ہونا قوم و ملت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے، ان کی قدامت، اور عام و خاص میں ان کی مقبولیت رازِ سربستہ ہے، جو ہمیں دعوتِ عمل دیتا ہے، یہ صحیح ہے کہ ملفوظات کے جو نسخے دستیاب ہوتے ہیں، وہ خامیوں سے مبرا نہیں، مگر وہ خامیاں ایسی بھی نہیں جو دفع نہ ہو سکیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ قدیم سے قدیم نسخوں کا کھوج لگائیں، اور نقد و مقابلہ کی صیقل سے اصل کا آئینہ بنا دکھائیں، چودہویں صدی کی یہ جیتی جاگتی کرامت ہے کہ جن کتبِ ملفوظات کے وجود سے انکار کیا جا رہا ہے، اور جنہیں جعلی قرار دیا جا رہا ہے، اور جنہیں مابعد کے کسی شخص کے ذہن کی خلاقی کا نتیجہ بتایا جا رہا ہے، (ص ۱۴۰) ان کے قدیم ترین (۷۳۲ھ، [illegible]) کے نسخوں کا سراغ ملنے لگا ہے، اور جنہیں معتبر و مستند بتایا جا رہا ہے، بارہویں صدی

تک پہنچ کر ان کے نشانِ قدم کا کھوج نہیں ملتا، بارہویں صدی تک بھی جو کھوج ملتا ہے وہ ظنی اور قیاسی ہے، حقیقی نہیں ہے، یہ امدادِ غیبی بھی ہے، اور پیرانِ باصفا کی کرامت بھی ہے اور عقیدتمندوں کے لئے دعوتِ ایثار و عمل بھی ہے، دیکھئے پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے اور کون یہ سعادت حاصل کرتا ہے، یخلق ما یشاء و یختار،

تصنیف و تالیف | کسی موضوع یا کسی عنوان سے متعلق معلومات فراہم کرکے اپنے خیالات اور اپنی معلومات کو سلیقے سے سپردِ قلم کرنا تصنیف ہے، تصنیف کسی اہلِ قلم کی ذاتی جدت و جہد اور اس کے اپنے خیالات و رجحانات کا مرقع ہوتی ہے، مصنف ہی اس کا ذمہ دار ہوتا ہے، "تالیف" عرفِ عام میں مختلف مضامین (نثر و نظم) کو ایک جا جمع کرنے کو تالیف کہتے ہیں، اور تالیف کرنے والے کو مولف کہتے ہیں، مؤلف کسی ایک شخص کے مضامین کو بھی جمع کر سکتا ہے اور مختلف اشخاص کے مضامین کو بھی، کتبِ ملفوظات کو بھی تالیف سے تعبیر کرتے ہیں اگرچہ ہم ہلکا سا امتیاز بھی ہے، اور وہ یہ کہ مؤلف مرتب شدہ مضامین کو جمع کرتا ہے، جو کسی ایک سے مخصوص ہوتے ہیں، یا زیادہ سے، مگر کتبِ ملفوظات میں سے ہر ایک کسی ایک ہی کی آوازِ بازگشت ہوتی ہے، جس کو سن کر مرتب کیا جاتا ہے، اس لئے بغرضِ امتیاز ملفوظات کے مرتب کرنے والے کو جامع بھی کہتے ہیں،

جامع ملفوظات | جامع ملفوظات کو استحقاق ہوتا ہے، کہ اگر دورانِ گفتگو میں کوئی واقعہ پیش آ جائے، تو اس کی روداد بھی ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ مثلاً فلاں آیا، مقرر اس کی طرف متوجہ ہوا، اور اس سے یہ گفتگو ہوئی، یا فلاں نے یہ سوال کیا، اور اس کا یہ جواب دیا، اس اعتبار سے ملفوظات کی نہ تو وہ نوعیت رہتی ہے، جو ان مضامین کی ہوتی ہے جنہیں مولف تالیف کرتا ہے، اور نہ تقریرِ مسلسل ہی کی نوعیت برقرار رہتی ہے، اس لئے ملفوظات

نہ بعینہٖ تقریر ہوتے ہیں، اور نہ بعینہٖ تالیف، جامع ملفوظات بھی اس اعتبار سے قدرے مؤلف سے ممیز ہوتا ہے، لیکن عرف عام میں ملفوظات کو تالیف سے اور جامع کو مولف سے بھی تعبیر کرتے ہیں، تاہم یہ امتیازات ذہن میں محفوظ رہنے چاہئیں۔

ملفوظات کو اُن یادداشتوں کے مثل جاننا بھی صحیح نہیں جو اساتذہ درس کے دوران کسی عنوان سے متعلق طلبہ کو لکھواتے ہیں، اس لئے کہ وہ تقریر نہیں، بلکہ مضمون مسلسل ہوتے ہیں جو اکثر مرتب کئے ہوئے ہوتے ہیں، خواہ وہ زبانی بیان کئے جائیں، ان کی نوعیت ہرگز تقریر کی سی نہیں ہوتی، پھر وہ عموماً وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں، مگر ملفوظات جب تک وہ محفوظ رہ سکتے ہیں، شمعِ ہدایت ہوتے ہیں، اس مختصر معلومات سے مجموعۂ ملفوظات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تصنیف نہیں ہوتے، اور ان پر تالیف کا بھی پورا اطلاق نہیں ہوتا اور یہ غلط فہمی رفع ہوتی ہے،

"بخوبی ممکن ہے اس کا سبب یہی رہا ہو کہ ہمارے شیوخ نے کتابیں نہیں لکھی ہیں تو ہم کیوں تصنیف و تالیف کی طرف التفات کریں، متابعت کاملۂ شیخ اور اتحاد مطلب کا ان بزرگوں کے ہاں اتنا ہی اہتمام ہوتا تھا، .... یہ ذاتی یادداشت تھی، اسے کتابی صورت میں مرتب کرکے شائع کرنے کا کبھی ارادہ نہیں تھا،

(منادی دہلی ص ۱۳۶ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ سنہ ۱۹۷۴ء)

مجموعۂ ملفوظات کو تصنیف و تالیف سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، متابعت شیخ اور اتحاد مطلب کا بھی وہ مدعا نہیں جو تنقید نگار سمجھتے ہیں، اگر یہی مطلب ہوتا تو حضرت محبوب الٰہیؒ یہ کیوں فرماتے :۔

"سہ چیز کہ شیخ کبیر .... را میسر شد من نمی توانم کرد،

اول آن کہ ہر روز غسل کردے الخ ...... (سیر الاولیا ص ۳۸۶)

حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے "نسخہ کردم" اس کا مدعا یہی ہے کہ آپ نے حضرت باباؒ صاحبؒ کے ملفوظات کو کتابی شکل میں مرتب فرمایا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ شائع کرنے کا ارادہ نہ تھا حضرت محبوب الٰہیؒ کے دل کی بات آج کون جان سکتا ہے،

نوشتہ کا اطلاق

نوشتہ کا اطلاق ہر تحریر پر ہوتا ہے، تصنیف، تالیف، نقل کتاب، یادداشت، قطعہ، طغرا، مراسلہ، رقعہ، دستاویز، کتبہ .... نظم و نثر سب ہی تحریریں نوشتہ میں شمار ہوتی ہیں، البتہ قرینے سے اطلاق کا امتیاز ہوتا ہے، ۱۵ محرم ۷۱۷ھ کی مجلس میں خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ نے ذکر کیا ہے،

عزیزے حاضر بود، عرض داشت	ایک دوست تھے، انھوں نے عرض
کرد کہ مرا در اودھ مردے کتابے	کیا کہ ایک شخص نے اودھ میں مجھے
نمود۔ گفت کہ ایں بنشتۂ خدمتِ	کتاب دکھائی، (اور) کہا کہ یہ حضرت
مخدوم است، خواجہ ذکرہ اللہ	والا کی لکھی ہوئی ہے، آپ نے فرمایا
بالخیر گفت کہ تفاوت گفتہ است	اُس نے تفاوت (فرق) سے کہا ہے،
من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام،	(دو چیزوں کے درمیان دوری کو فرق ہے) میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔
(فوائد الفواد ص ۴۵)	

یہ بیان واضح نہیں مبہم ہے، نوشتہ کا مفہوم وضاحت طلب ہے، تفاوت گفتہ سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کہ نوشتہ کا مفہوم مبہم ہی ہے، مطلب یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ لکھا ہے، مگر وہ کتاب نہیں لکھی جو اس کے تصرف میں ہو سکتی ہے، کیونکہ مجموعی طور پر نوشتہ سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا تھا، ایسا لگتا ہے کہ اسی مماثلت سے کسی کو شبہ ہوا تھا، تاہم جس

خیال سے یہ بات کہی گئی تھی، حضرت محبوب الٰہیؒ نے کمال بلاغت سے اسی کے لفظ کو منفی صورت میں دہرادیا، تاکہ نوشتہ کا جو مفہوم اس کے ذہن میں تھا، کلیتہً اس کی تردید ہو جائے، اس سے بھی اس کے معہود ذہنی کی نوعیت واضح نہیں ہوتی کہ وہ کس موضوع سے متعلق تھی تصنیف تھی یا تالیف تھی "من ہیچ کتابے نہ نوشتم" سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، ورنہ لکھنے کو تو آپ نے کیا کچھ نہ لکھا ہوگا، حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات بھی لکھے تھے جنھیں بصورت کتاب ہی مدون فرمایا تھا، آپ کا ارشاد ہے،

"ہرچہ از شیخ شنودہ شد، نوشتم، چوں بمقام خود باز آمدم برجائے نسخہ کردم ....تا ایں غایت آن مجموعہ برمن است"

(فوائد الفواد ص ۳۰)

یہ کہ نسخہ کردم کیا ہے، ؟ کتاب نہیں لکھی تھی، تو اور کیا لکھا تھا" مگر ہیچ کتابے نہ نوشتم" کا مدعا یہ ہے کہ معہود ذہنی جیسی میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے، گویا کہ یہ جملہ معہود ذہنی سے متعلق ہے، وہ سب تحریریں مستثنیٰ ہیں، جو آپ کے قلم سے نکلی تھیں، یہ جملہ تمام تحریروں سے متعلق نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے، کہ جو سوال صوفی حمید الدین ناگوریؒ سے کئے گئے تھے، اور جو انھوں نے جواب دیئے تھے، وہ آپ نے ایک کتاب کے حاشیہ پر لکھے تھے، (سیر الاولیا، ص ۱۰۰) جو حال ہی میں پاکستان میں رسالہ سوال و جواب کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، شمائل الاتقیا، جو آپ کے بزرگ خلیفہ شیخ برہان الدین غریبؒ کے ایما سے مرتب ہوئی تھی، اس میں رسالہ قوام العقائد آپ کی تصنیف سے فہرستِ ماخذات میں موجود ہے، اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد کوئی الجھن باقی نہیں رہتی، (باقی)

....

راجہ جے سنگھ کی رصد گاہیں

از

جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف نومبر ۷۹ء

جے سنگھ کا مسلم ماخذ

سلطنت مغلیہ کے عظیم ترین اور خاندانی وفادار ماتحت امبر راج کا فرزند ارجمند ہونے کے ناطے چھوٹے راج کمار جے سنگھ کے لئے وقت کے علوم متداولہ کی اعلیٰ تعلیم کا بڑے شایانِ شان طریقہ پر انتظام کیا گیا ہوگا، اور اگرچہ اسے حصول تعلیم کے لئے زیادہ وقت نہیں مل سکا، کیونکہ تیرہ[۱۳] سال ہی کی عمر میں وہ سایۂ پدری سے محروم ہوگیا[۱]، اور امبر راج کی گدی اور اس سے زیادہ خاندانی وقار کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فوراً ہی فوجی خدمات کی انجام دہی کے لئے بچپن کی بے فکر زندگی کو خیرباد کہنا پڑا[۲]، مگر اتنے قلیل عرصہ ہی میں اس نے مختلف علوم میں غیر معمولی دستگاہ حاصل کرلی؛

---

[۱] جے سنگھ ۱۶۹۹ء مطابق ۱۱۲۱ھ میں پیدا ہوا تھا اور ۱۷۲۳ء مطابق سنہ چوالیس جلوس عالمگیری امبر کا راجہ بنا۔

"دھیراج راجہ جے سنگھ سوائی ... بعد فوت پدر بسال چہل و چہارم جلوس خلد مکان از اصل و اضافہ بمنصب ہزار و پانصدی ہزار سوار و خطاب راجہ جے سنگھ ... امتیاز داشتند" (مآثر الامرا، ج ۲، ص ۸۱)

[۲] "سال چہل و پنجم ہمراہ اسد خاں بتسخیر قلعہ سنحر لنا ع کھلنا نامزد گردید، و در گرفتن قلعہ مذکور روز یورش کارہائے دست از و بوقوع آمد" (مآثر الامرا، ج ۲، ص ۸۱)

ان میں سب سے اہم فارسی ادب تھا، جس پر قدرت کا ثبوت اس کی مرتب کردہ "زیج محمد شاہی" کا دیباچہ ہے، اس کی تحریر میں وہ اس وقت کے صف اول کے فارسی انشاپردازوں کے دوش بدوش نظر آتا ہے، عام طور پر مصنفین اپنے فضل وکمال کا مظاہرہ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول اور مدح بادشاہ وقت میں کیا کرتے ہیں اور سوائی جے سنگھ بھی ان سے کم نہیں ہے، چنانچہ حمد باری تعالیٰ میں لکھتا ہے:

"ثنائے کہ خرد خردہ بین ہندسان عقدہ کشائے درادا دمے دقیقہ، ازاں زبان اعتراف بعجز وقصور کشاید، وستائشے کہ فکر اصابت قرین راصدان فلک پیمائے بادلین درجہ آں شرح وبیان اقرار بتحیر ونارسائی نماید، نثار بارگاہ شہنشاہے کہ طباق سمٰوٰت بلند ورقے است چنداز دفتر دیوان قدرت او تقدست اسمارہ، وانجم وخورشید آسماں پیوند دینار ودرہمے است معدود از خزینہ خازن سلطنت وے تعالت آلاءہ[1]"

جزالتِ کلام کے ساتھ صنائع وبدائع بالخصوص براعت استہلال کا استعمال ملاحظہ ہو۔

"اگر صفحات زیج اقالیم زمین را بجداول انہار ورقوم نجوم اشجار محلی ومزین نمی ساخت، ہیچ مستخرجے استخراج تقویم انواع حبوب وثمار نتوانست نمود، واگر راہ ظلمت آباد عناصر رابمشاعل ثوابت وسیار تابدار ومہتاب وآفتاب نور بار ظاہر نمی کرد، دررسیدن بسر منزل مقصود ونجات از ورطات غفلت مہالک چہ ممکن بود[2]"

صنعت براعت استہلال کی مندرجۂ ذیل مثال اس لئے اہم ہے کہ اس سے بعض مصنفین نے اس کے مآخذ ومصادر کو مستنبط کیا ہے:

"از نارسائی غور محیط قدر تش ابر خس خسے است برہم زدن دست افسوس ودر اندیشہ ارتفاع قدر تش

[1] زیج محمد شاہی (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلیکشن فارسیہ علوم ۳۰، ص ۲، ورق اب۔

[2] زیج محمد شاہی، ورق ۱ ب

بطلمیوس خفاشے است از رسیدن بآفتاب حقیقت مایوس، براہین اقلیدس دربیانِ اشکال صنائع او حرفے ناتمام وہزاراں جمشید کاشی چوں نصیر طوسی در پختن سودائے خام[1]"

بادشاہ وقت کی تعریف میں اشہب قلم کی جولانی دکھاتا ہے:

"حضرت قدر قدرت، مہر سپہر ابہت وکامگارے، غرہ عظمت وشہریاری، دریکائے بحر خلافت کبریٰ، در بے ہمتائے فلک سلطنت عظمیٰ، خورشید علم، قمر حشم، مریخ رزم، عطارد قلم، ناہید دم، سپہر آستاں، مشتری نگین، کیوان پاسبان، السلطان ابن السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان ابن الخاقان سکندر جاہ ظل اللہ بادشاہ غازی محمد شاہ لازال مظفراً فی المعارک والمغازی[2]"

لیکن دیباچہ میں "نعت رسول" نہیں ہے، جس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ راجہ انتہائی متعصب اور اسلام بیزار تھا، یہ صحیح ہے کہ ایک ہندو ادیب پیغمبر اسلامؐ کی نعت کے لئے مکلف نہیں ہے، اگرچہ یہ رسم معروف اور وقت کا دستور معہود تھی، دوسرے ہندو مصنفین بھی تھے جو اگر کسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ کی مصرح طور پر نعت نہ لکھتے تو بھی کم از کم انبیاء ورسل کی روح پر فتوح کو نذرانۂ عقیدت پیش کئے بغیر نہ رہتے، مثلاً جے سنگھ سے کچھ عرصہ پہلے سبحان رائے بھنڈاری نے "خلاصۃ التواریخ" میں "نعت رسول" تو نہیں لکھی مگر انبیاء ورسل کی تعریف ضرور کی:

"دربیان خاصان درگاہ ایزدی وتعریف آخر سرورِ عالم

بنابر استحکام ادیان در ہر دیار وہر فریق یکے از خاصان جناب صمدیت را بخلعت بشری مخلع گردانیدہ، واوراآں قدر قدرت عطا فرمودہ کہ عارف دقایق عقول ونفوس وکاشف حقائق معقول ومحسوس بود ......

وبالہام ربانی کتاب آسمانی بدست داشتہ خلایق را ہادی وادی ایزد پرستی ورہ نمودن راہ

[1] زیج محمد شاہی، ورق اب تا [2] زیج محمد شاہی ورق اب ۲ ط

خدا شناسی گشت"[1]

مگر راجہ کی چھپی ہوئی اسلام بیزاری و اسلام دشمنی اسے ان رسمیات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی، پھر یہ کوئی اتفاقی بات بھی نہیں تھی، اسے اسلام اور اسلامیات سے بغض و عناد تھا، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

"زیج محمد شاہی" اور "زیج الغ بیگ" کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر ثانی الذکر کا سرقہ نہیں تو چربہ تو ضرور ہے، نہ صرف تقسیم ابواب میں مماثلت ہے، مواد میں بھی یکسانی ہے، بالخصوص مقالۂ دوم کے ابواب کے موضوع اور عنوان، نیز ان کا مواد، ضمائر کے اختلاف سے قطع نظر بالکل ایک ہیں (مزید تفصیل آگے آئے گی) "زیج الغ بیگ" کا اٹھارہواں باب دو ستاروں کے درمیانی فاصلہ کی معرفت میں ہے:

"باب ہیژدہم در استخراج بعد میان دو کوکب"[2]

اور بیسواں باب ستارے کے ارتفاع سے اس کا طالع معلوم کرنے کے باب میں:

"باب بستم در معرفت طالع از ارتفاع"[3]

"زیج محمد شاہی" میں بھی سترہواں باب "دو ستاروں کے درمیانی فاصلہ کی معرفت میں"[4] اور اٹھارہواں باب "ارتفاع کوکب سے اس کا طالع معلوم کرنے کے باب" میں ہے[5] مگر "زیج الغ بیگ" میں اٹھارہویں اور بیسویں باب کے درمیان انیسواں باب "سمت قبلہ اور اس کا انحراف معلوم کرنے کے باب" میں بھی ہے۔

"باب نوزدہم در سمت قبلہ و انحراف او"[6]

---

[1] سجان رائے بھنڈاری: خلاصۃ التواریخ ص ۲، [2] زیج الغ بیگ ص ۲۰ظ، [3] زیج الغ بیگ ص ۲۱، [4] زیج محمد شاہی ص ۱۰ظ، [5] زیج محمد شاہی ص ۱۱ظ۔ [6] زیج الغ بیگ ص ۲۱ظ۔

اور مذہبی نقطۂ نظر سے علم الہیئت کا یہ ایک عظیم فائدہ ہے، لیکن چونکہ "توجہ الی القبلہ" نماز کا رکن رکین ہے اور نماز دین اسلام کا عظیم ستون، لہٰذا باوجودیکہ "زیج محمد شاہی" ایک مسلمان بادشاہ کے نام ہی معنون نہیں کی گئی تھی، بلکہ اس کے حکم کی تعمیل میں اور اس سے زیادہ یہ کہ اس کی دی ہوئی رقم کثیر (تیس لاکھ روپیہ[1]) سے مرتب ہوئی تھی، راجہ کی اسلام بیزاری نے اس مبحث کا باب باندھنے یا الغ بیگ کی عبارت دُہرانے تک کی اجازت نہیں دی۔

اور سیاسی طور پر وہ اُس سازش کا سربراہ تھا جو ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے استیصال اور اس کی جگہ ہندو راشٹر کے قیام کے لئے ہندوؤں کے مختلف طبقوں (راجپوتوں، مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں) میں کی جا رہی تھی۔

(۲) لیکن یہی چیز یعنی "نعت رسول" اور "معرفت سمت قبلہ کے باب" کا ترک اس بات کی بھی دلالت ہے کہ یہ زیج ضرور راجہ ہی کی مرتب کردہ ہے، یہ نہیں کہ اس نے اپنے ماتحتوں سے یا معاوضہ پر لکھوائی ہو، اگر ایسا ہوتا تو وہ کسی مسلمان ہی سے لکھواتا اور وہ یہ دونوں کام نہ کرتا۔

ظاہر ہے جب راجہ کو فارسی انشا پردازی میں یہ دستگاہ عالی حاصل تھی تو دیگر علوم متداولہ میں بھی یہی تبحر و تمہر ہوگا، مگر اس نے اپنی افتاد طبع کے پیش نظر ان علوم میں سے ریاضی و ہیئت میں خصوصی کمال حاصل کیا، چنانچہ "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ میں کہتا ہے:

"ایں خیر خواہ اصناف آفرینش و تماشا کارگاہ دانش و بینش سوائی جے سنگھ از بدو فطرت و عنوان شعور بفن ریاضی مشغوف و مالوف بود و ہموارہ عنان طبعش بکشف دقائق و حل غوامض آں مصروف، و بتائید کردگار از اصول و قوانین آں حظے وافر

---

[1] مولانا عبد الحی حسنی: نزہۃ الخواطر (دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء) الجزء السادس، ص ۲۵۸۔

ونصیبے کامل حاصل کرد[1]"

لیکن فن ریاضی میں شوق وشغف اور تبحر وتمہر کے ساتھ راجہ کے مزاج میں مذہب پسندی بدرجۂ اتم رچی ہوئی تھی۔ وہ ایک راسخ العقیدہ ہندو تھا اور جملہ مذہبی مراسم کو ان کے صحیح وقت پر انجام دینے کا اہتمام کرنا چاہتا تھا[2] اس غرض سے فطری طور پر اس نے ہندو جوتش سے رجوع کیا۔ مگر جوتش کی قدیم وجدید کتابیں اس باب میں اس کے دقت پسند معیار کو مطمئن نہ کر سکیں اور اس لئے اس نے بقول جی۔ ایم۔ موریس مسلم علم الہیئت کی طرف توجہ کی[3]

یوں بھی اس زمانہ میں سماج کے اعلیٰ علمی طبقوں میں اسلامی علوم بالخصوص معقولات کا عام رواج تھا، بالخصوص موخرالذکر میں دستگاہ عالی حاصل کئے بغیر کسی فاضل کا علم وفضل غیر مکمل سمجھا جاتا تھا، ان علوم عقلیہ میں ریاضی وہیئت بھی شامل تھی جس کا مغل دور میں اکبر کے بعد سے بہت زیادہ رواج بڑھ گیا تھا، اس کے اندر ہندو اور مسلمان کا کوئی امتیاز نہ تھا چنانچہ راجہ کا دست راست جگنّاتھ پنڈت جو اپنے وقت میں سنسکرت علوم کا فاضل نبیل تھا عربی زبان اور مسلم علم الہیئت میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔

پھر سلطنت مغلیہ کے عظیم ترین اور وفادار ماتحت امبر واج کا راج کمار ہونے کے ناطے راجہ جے سنگھ کے لئے بھی فارسی ادب کے ساتھ مسلم علم الہیئت کی تعلیم کا بھی بہترین انتظام کیا گیا تھا اور مستقبل کے عظیم ہیئت داں نے اس سے پورے طور پر استفادہ کیا۔

---

[1] زیج محمد شاہی: ص ۱۷۱۔ [2] زیج محمد شاہی: ص ۱۷۱۔

[3] Moraes G. M: Astronomical Mission Jai Pur P.L. 61-62 Moraes.

عام اور قدیم ماخذ کے برخلاف جے سنگھ نے اپنے پیش رو مسلمان ہیئت دانوں کی تصانیف کا نام بنام ذکر بھی کیا ہے، مگر ان کی تفصیل سے پیشتر ان دو مسلوں پر بھی ایک تحقیقی نظر ڈالنا مستحسن ہوگا جو اس کے ہندو ماخذ کی طرح اس سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں۔

مسلم ہیئتی ورثہ کی نوعیت مسلمان نہ تو اپنی تہذیب کے لئے اور نہ علمی بالخصوص ہیئتی سرگرمیوں کے لئے ایسی عسیر الیقین قدامت کا ادعا کرتے ہیں جو ہندوؤں کے ہاں عام ہے، اسلام بجائے خود ایک تاریخی حقیقت ہے، جس کی عمر صرف چودہ سو سال ہے، مگر کم یا زیادہ اس کی ہر سرگرمی "تاریخی حقیقت" کی مصداق ہے اور کسی حسابی یا فرضی وادعائی قیاس آرائی کی محتاج نہیں ہے۔

البتہ اسلام نے پہلے ہی دن سے دیگر علوم کی تحصیل کے ساتھ علم ہیئت کے حصول پر بھی زور دیا، اس طرح علم الہیئت کا آغاز صدر اسلام ہی میں ہوگیا ہے چنانچہ ایک جانب قرآن حکیم نے اجرام فلکی کے سیر وگردش کے مشاہدے کی ترغیب دی[1] اور جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر غور وفکر کرنے میں کوتاہی برتنے کو بدنصیبی بتایا[2] اور دوسری جانب اسلام نے نجوم اور جوتش کے ڈھکوسلوں کو منافیٔ اسلام قرار دیا[3]

باقاعدہ ہیئتی ادب کی ابتدا پہلی صدی ہجری کی آٹھویں دہائی سے ہوئی، جب کہ یزید بن معاویہ کے دوسرے بیٹے خالد نے (جو علوم حکمیہ کے ساتھ اپنے شغف کی بنا پر "حکیم آل مروان" کہلاتا تھا) کیمیا کے ساتھ طب اور نجوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کرایا[4]

باضابطہ ارصادی سرگرمیوں کا پتہ پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی میں چلتا ہے، جبکہ بقول ابوریحان البیرونی شہر بست میں سنہ ۹۰ھ اور سنہ ۱۰۰ھ کے درمیان متعدد سورج گہنوں کا مشاہدہ

---

[1] قرآن کریم: سورۂ یونس آیت ۵۔ [2] امام الدین ریاضی تصریح ص ۳، [3] ابن قتیبہ کتاب الانوار ص ۱۴

[4] ابن الندیم کتاب الفہرست، ص ۲۳۸ و ۴۹۱۔

کیا گیا تھا۔ (تحدید نہایات الاماکن، ص ۲۶۸)

اسلام کے ہیئتی ادب میں قدیم ترین تصنیف ابراہیم بن حبیب الفزاری کی "کتاب الزیج علی سنی العرب"[1] ہے، جسے اس نے دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے حکم سے مرتب کیا تھا، اس کے معاصرین نے بھی علم ہیئت میں مختلف کتابیں لکھیں، اس کے بعد ہارون الرشید کے عہد میں بطلیوس کے ہیئتی شاہکار "کتاب المجسطی" کا عربی میں ترجمہ ہوا۔[2] اسی زمانہ میں عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ جندیسا پور میں احمد بن محمد النہاوندی کی سرپرستی میں قائم ہوئی اور اس نے اپنی "الزیج المشتمل" لکھی[3]، اگلی صدی میں ساتویں خلیفہ المامون نے بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں تعمیر کرائیں، اور ان کے ارصادات کی مدد سے رصدگاہوں کے کارکنوں نے اپنی اپنی زیجیں مرتب کیں[4]۔ انہی فلکیاتی دریافتوں کی مدد سے سرکاری طور پر "الزیج الممتحن" تیار کی گئی۔

رصدگاہ مامونی کے بعد رصدگاہوں کی تعمیر کا ایک سلسلہ چل نکلا، چنانچہ ایک ترک محقق نے ان رصدگاہوں کی تعداد جو ۸۰۰ء اور ۱۰۵۰ء کے مابین قائم کی گئیں اور جن کے ارصادات کی تفصیل ہنوز دنیا کی لائبریریوں میں محفوظ ہے ایک سو چار بتائی ہے[5]، ان میں بیشتر سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ہوکر قائم کی گئی تھیں، جیسے البتانی اور ابوریحان البیرونی کی رصدگاہیں، ارصادی سرگرمیوں کے ساتھ فضلائے اسلام علم الہیئت میں بھی کتابیں لکھتے رہے، جن کی تعداد صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

قدیم ترین ہیئتی تصنیف جو زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہے، البتانی کی "الزیج الصابی" ہے جو اس کے ان فلکیاتی مشاہدات پر مشتمل ہے جو اس نے ۲۶۴ھ اور ۳۰۶ھ کے مابین کئے تھے

[1] ابن القفطی: تاریخ الحکماء، ص ۵۷ [2] ابن الندیم کتاب الفہرست ص ۲۷۴ [3] زیج ابن یونس ص ۱۴۱
[4] طبقات الامم ص ۵۰، Cambridge History of Iran, Vol V-P.672

چوتھی صدی ہجری عجم کے حسن طبیعت کے نکھار کا منتہائے کمال ہے، بویہیوں نے برسر اقتدار آتے ہی مختلف علوم حکمیہ کی سرپرستی پر غیر معمولی توجہ دی، بالخصوص نجوم و ہیئت کی ترقی میں، عبدالرحمٰن الصوفی، ابوجعفر الخازن، ابوالوفا البوزجانی الخجندی، ابونصر بن عراق، احمد ابن عبدالجلیل السنجزی اس عہد کے باکمال ہیں، اس صدی کا نصف آخر اور پانچویں صدی کا آغاز چار باکمالوں کے ظہور و نبوغ کے لئے مشہور ہے: عجم میں شیخ بوعلی سینا اور ابوریحان البیرونی اور مصر میں ابن الہیثم اور ابن یونس، البیرونی کی قانون مسعودی اور ابن یونس کی "الزیج الکبیر الحاکمی" اسلامی ہیئت کی ادبیات عالیہ کی مصداق ہیں۔

پانچویں صدی کے نصف آخر میں سلجوقی تاجدار ملک شاہ کے حکم سے عمر خیام کی نگرانی میں رصدگاہ اصفہان تعمیر ہوئی، جس کی مدد سے تقویم کی اصلاح اور تاریخ جلالی کا آغاز عمل میں آیا۔[1]

اگلی صدی میں عبدالرحمٰن الخازن نے "زیج سنجری" اور الخرقی نے "منتہی الادراک فی تقاسیم الافلاک" اور "التبصرہ فی الہیئۃ" مرتب کئے، صدی کے خاتمے پر الجغمنی نے "الملخص فی الہیئۃ" لکھی، جس کی "شرح چغمنی" کے نام سے کچھ عرصہ پہلے تک عربی مدارس کے اندر ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں داخل تھی۔

ساتویں صدی کے وسط میں ہلاکو نے حملہ کرکے عالم اسلام کو تہس نہس کردیا، مگر تاریخ کا یہ عجوبہ بھی موجب صد ہزار حیرت ہے کہ اسی کی زیر سرپرستی اسلامی علم الہیئۃ کی تجدید بھی ہوئی، اس نے محقق طوسی کی نگرانی میں مراغہ کی رصدگاہ تعمیر کرائی، یہ دنیا کی پہلی رصدگاہ تھی جو بین الاقوامی انداز پر قائم کی گئی، کیونکہ اس میں مغرب و اندلس کے علاوہ کم از کم ایک چینی

[1] ابن الاثیر، کامل التواریخ، المجلد العاشر (مطبوعہ بیروت ۱۳۸۶ھ، ۱۹۵۰ء، ص ۹۸۔

ہیئت داں بھی شریک تھا۔[1] رصدگاہ مراغہ کی دریافتیں "زیج ایلخانی" میں مرتب کی گئیں۔

رصدگاہ مراغہ کے نگرانِ اعلیٰ خواجہ نصیر الدین طوسی تھے جنھیں بجا طور پر نہ صرف اسلامی فلسفہ بلکہ اسلامی ہیئت کا بھی "مجدد" کہنا چاہئے، "زیج ایلخانی" انھیں کی تصنیف ہے، اس کے علاوہ انھوں نے "المجسطی" کا بھی نیا ایڈیشن تیار کیا اور بعد میں یہی ایڈیشن "تحریر المجسطی" کے نام سے مستعمل رہا، انھوں نے علم الہیئۃ کا ایک متن متین بھی "تذکرہ" کے نام سے مرتب کیا، جو عرصہ تک ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں مشمول رہا، اور بھی کتابیں لکھیں جن میں "بست باب" اسطرلاب میں اور "الشکل القطاع" کروی مثلثات میں مشہور ہیں۔

اگلی صدی کے فضلاء کی ہیئتی سرگرمیاں جغمینی کے "الملخص" اور محقق طوسی کے "التذکرہ" کی شروح لکھنے میں محدود ہیں، ان شراح میں نظام اعرج اور میر سید شریف خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

نویں صدی ہجری کے نصف اول میں عجم کی آخری قابلِ ذکر رصدگاہ تعمیر ہوئی، یہ سمرقند کی رصدگاہ تھی جسے تیمور کے پوتے الغ بیگ نے قائم کیا تھا، وہ خود زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھا، اور علوم ریاضی و ہیئت میں سرآمد فضلائے روزگار تھا، صاحب "مطلع السعدین" نے اس کے علم و فضل کے بارے میں لکھا ہے:

"مرزا الغ بیگ کہ در علوم و فنون صاحب نصیب اوفی و نصاب مستوفی بود۔[2]"

اسی طرح صاحب "حبیب السیر" اس کے علم و فضل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دانش جالینوس با حشمت کیکاؤس جمع فرمودہ و در سائر فنون خصوصاً علم ریاضی و نجوم در آں زماں عدیل و نظیر او کسے نبود۔[3]"

---

۱ تاریخ بناکتی بحوالہ ہوزون یند حمم ج ۱ ص ۲۱۶، ۲ عبدالرزاق کاشی: مطلع السعدین ص ۲۳۷ ۳ خواندمیر: حبیب السیر ج ۳، جزو سوم ص ۱۵۱

دولت شاہ اس کے تبحر فی النجوم والہیئۃ کے بارے میں لکھتا ہے:

"اما سلطان مغفور سعید الغ بیگ گورگان .... در علم نجوم مرتبۂ عالی یافتہ، و در معانی موے می شگافت۔[1]"

علم و حکمت بالخصوص ریاضی و ہیئت کی ترقی کے لئے اس نے دنیا کی پہلی "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی تھی جس کے ارکان اربعہ مولانا معین الدین کاشی، غیاث الدین جمشید کاشی، مولانا صلاح الدین موسیٰ المعروف بقاضی زادہ رومی اور مولانا علاء الدین علی قوشجی تھے، ۸۲۳ھ میں اس کے باپ شاہ رخ نے اسے ماوراء النہر کی حکومت عطا کی اور ۸۲۴ھ میں اس نے سمرقند میں دوسری عمارات کے علاوہ ایک رصدگاہ قائم کی جس کے اندر استعمال کے لئے بقول گستاولی بان

"اس نے ایسے کامل آلات رصد بنوائے جو اس وقت تک نہیں بنے تھے۔[2]"

رصدگاہ کی تولیت پہلے مولانا غیاث الدین جمشید کاشی کو تفویض ہوئی مگر جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا تب یہ عہدہ بادشاہ نے صلاح الدین موسیٰ المعروف بہ قاضی زادہ رومی کو عطا کیا مگر وہ بھی کار رصد کے اختتام سے پہلے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے،[3] لہٰذا الغ بیگ نے بہ نفس نفیس اپنے شاگرد رشید مولانا علاء الدین علی قوشجی کی مدد سے اس کام کو سرحد تکمیل تک پہونچایا،[4] اور نئی دریافتوں کو "زیج جدید سلطانی" (یا "زیج الغ بیگ") میں مدون کیا، دولت شاہ اس زیج کے بارے میں لکھتا ہے:

"والیوم نزد حکما آں زیج متداول و معتبر است و بعضے آں را بر زیج نصیری ایلخانی ترجیح می کنند۔[5]"

---

۱ دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء (مطبوعہ بریل لیڈن ۱۹۰۰ء) ص ۳۶۱ ۲ گستاولی بان: تمدن عرب ص ۴۲۲

۳ الشقائق النعمانیہ برحاشیہ تاریخ ابن خلکان، ج ۱، ص ۸، ۴ زیج الغ بیگ ص ۲ ط ۵ تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۶۲

صاحب مطلع السعدین اس زیج کی مقبولیت وافادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آں زیج تصحیح یافتہ باتمام رسید و بزیج سلطانی گورگانی موسوم شد و درمیان مہرۂ صناعت تنجیم و اصحاب تقاویم معمول و متداول است"[1]

مستشرقین کی تحقیق کے مطابق رصدگاہ سمرقند تاریخ اسلام کی آخری رصدگاہ تھی، اور وہ اسی پر اسلام کی ہیئتی سرگرمیوں کے تذکرے کو ختم کردیتے ہیں، چنانچہ کارادی دو جس نے مسٹر آرنلڈ کے مرتبہ "ورثۂ اسلام" میں مسلمانوں کی ریاضی وہیئت پر مقالہ لکھا ہے، اس کے آخر میں لکھتا ہے:

"آخر میں ہمیں سمرقند کے ہیئت دانوں کا ذکر کرنا چاہیے، جنھوں نے ۱۴۳۷ء میں تیموری خاندان کے ایک بادشاہ کے لیے "زیج الغ بیگ" کے نام سے ہیئتی جداول مرتب کی تھیں، انھیں یورپ میں بڑے احترام سے دیکھا جاتا تھا، چنانچہ اٹھارویں صدی میں ان کا ایک جزء انگلستان میں شائع ہوا"[2]

دوسرا مستشرق شاخت کہتا ہے کہ رصدگاہ سمرقند سے متاثر ہوکر عالم اسلام کے وسطی علاقہ روم (ترکیہ) کے شہر استانبول میں ۱۵۳۷ء میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جس کی تقلید میں یورپ کے اندر رصدگاہوں کی تعمیر کا ایک سلسلہ جاری ہوا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رصدگاہ سمرقند نے (جسے ۱۴۲۰ء میں الغ بیگ نے تعمیر کرایا تھا) رصدگاہ استانبول کے قیام پر فیصلہ کن اثر ڈالا (تاریخ تعمیر ۱۵۷۵ء) موخرالذکر اپنی نوبت میں سترہویں صدی کے اندر یورپ کی رصدگاہوں کی تعمیر کے لیے موثر قوی ثابت ہوئی، اس کے اندر استعمال کردہ آلات رصدیہ ٹائکو براہے کے آلات میں شدید مماثلت تھی"[3]

---

[1] مطلع السعدین ص ۲۳۹ [2] Arnold: Legacy of Islam P. 377 [3] Schacht: Legacy of Islam - P. 487

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہیئتی سرگرمیوں کا سلسلہ اسلامی دنیا میں اس کے بعد بھی جاری رہا، بالخصوص ہندوستان میں، عجم میں دسویں صدی ہجری میں دو مشہور ہیئت داں ملتے ہیں، احمد خضری جنھوں نے محقق طوسی کے "تذکرہ" کی شرح لکھی اور مولانا نظام الدین مولانا عبدالعلی برجندی جنھوں نے محقق طوسی کی اکثر ہیئتی تصانیف کی شروح لکھیں، ان کے علم وفضل کے بارے میں صاحبِ "حبیب السیر" نے لکھا ہے:

"مولانا عبدالعلی برجندی جامع اصناف علوم محسوس ومعقول است وحاوی انواع مسائل فروع واصول، درعلم نجوم وحکمیات بےمثیل وبدل است ودر شیوۂ زہد وتقویٰ ضرب المثل ..... ہموارہ نقش افادہ وتالیف بر صحیفۂ خاطر شریف می نگارد"[1]

اسی طرح "جامع بہادرخانی" کے مصنف ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ان کا خیال ہے کہ تین سو سال تک ان جیسا ماہر ریاضی وہیئت پیدا نہیں ہوا:

"واز عہد قدوۃ المرتاضین، مولانا عبدالعلی البرجندی طاب اللہ ثراہ تاایں زماں کہ تخمیناً سہ صد سال قمری گذشتہ است، کتابے کہ مساہمت مجسطی وشروح تذکرہ نغیر بانماید..... بعبارت واضح حسن ترتیب نیافتہ است"[2]

گیارہویں صدی ہجری کے ایران میں ایک شیعی عالم ملتے ہیں، وہ شیخ بہاءالدین عاملی ہیں، انھوں نے علم الہیئت میں ایک متن متین "تشریح الافلاک" کے نام سے لکھا جو بہت زیادہ مقبول ہوا، لیکن علم الہیئت کو زیادہ ترقی ہندوستان میں نصیب ہوئی، بالخصوص مغلوں کے آنے کے بعد، پہلے مغل تاجدار بابر کا بیٹا ہمایوں خود نجوم وہیئت کا ماہر تھا اور اس فن کے ماہرین کا قدرداں، اس کے عہد کے مشہور فضلائے ہیئت میں ابوالقاسم استرآبادی، مولانا الیاس اردبیلی

---

[1] حبیب السیر ج ۳ جزء چہارم ص ۱۱۰، [2] جامع بہادرخانی ص ۳۔

نورالدین تیرخان، مولانا چاند اور مصلح الدین لاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اول الذکر سے بادشاہ نجوم وہیئت کا مذاکرہ کیا کرتا تھا، مولانا چاند کی "تسہیلات" راجہ جے سنگھ کے زمانہ تک مشہور تھی اور اس نے اس سے استفادہ بھی کیا تھا، مصلح الدین لاری نے قوشجی کے رسالہ فی الہیئۃ کی شرح "ہمایوں نامہ" کے نام سے لکھ کر بادشاہ کے نام معنون کی تھی[1]،

نجوم وہیئت کے ساتھ اکبر کا شغف اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اس نے مدارس میں علوم دینیہ کی تعلیم کے بجائے ان علوم کی تعلیم کے لئے شاہی حکم جاری کیا[2]، اس کے عہد کی نادرۂ روزگار شخصیت امیر فتح اللہ شیرازی تھے، جنھوں نے تقویم کی اصلاح کر کے سن الٰہی جاری کیا تھا[3]۔

مگر مغل دور نے ملا فرید منجم دہلوی سے بڑا کوئی ہیئت داں پیدا نہیں کیا، اس نے اپنے بھائی ملا طیب اور دوسرے یونانی، عربی علم الہیئت اور ہندو جوتش کے ماہرین کے ساتھ مل کر وزیر اعظم آصف خان کی نگرانی میں "زیج شاہجہانی" مرتب کی تھی، یہ اتنی مقبول ہوئی کہ اس فن کے ماہرین کو زیج الغ بیگ کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیا، اس کی غیر معمولی افادیت کے پیش نظر بادشاہ نے اسے ہندی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا[4]۔

عہد شاہجہانی کے دوسرے ماہر علم الہیئت ملا محمود جونپوری تھے، جن کی "شمس بازغہ" نے ہیئت داں کی حیثیت سے ان کی شہرت کو ماند کر دیا ہے، وہ بادشاہ کے پاس رصدگاہ کے قیام کی تجویز لے کر گئے تھے، مگر وزیر اعظم نے اسے نامنظور کر دیا[5]۔

---

[1] اس کتاب کے دو مخطوطے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہیں، ایک سبحان اللہ خاں کلکشن میں نمبر ۵۲۰/۱۶ فلکیات فارسی" اور دوسرا ذخیرہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی میں نمبر ۱۱/۳ علوم فارسیہ [2] دبستان المذاہب ص ۳۲۸، [3] آئین اکبری ج ۲ ص ۲۳۱ [4] عمل صالح ص ۳۶۱-۳۶۲ [5] آزاد بلگرامی، مآثر الکرام ص ۳۰۰،

اسی زمانہ میں احمد معمار کا خاندان ریاضی وہیئت میں اپنے تبحر و تمہر کے لئے مشہور تھا، ان کے صاحبزادے لطف اللہ ہندسہ و نجوم سے اپنے غیر معمولی شغف کی بنا پر مہندس کہلاتے تھے اور پوتے مولانا امام الدین کا تخلص "ریاضی" تھا، اوپر شیخ بہاء الدین کے رسالہ "تشریح الافلاک" کا ذکر آچکا ہے، امام الدین ریاضی نے "التصریح" کے نام سے اس کی شرح لکھی، جو آج کے دن تک مدارس عربیہ میں ہیئت کے نصاب میں داخل ہے، ان سے پہلے ملا عصمت اللہ سہارنپوری نے "باب تشریح الافلاک" کے نام سے اس کی شرح لکھی تھی، امام الدین ریاضی نے ہندسہ کردیہ اور دیگر رسائل متوسطات کی مدد سے ان کے خلاصے تیار کئے تھے، انھوں نے قاضی زادہ رومی کی شرح چغمنی پر حاشیہ بھی لکھا تھا اور اس کے اندر "تنقیح المقال" کے عنوان سے رصد خانوں کے قیام و تعمیر پر ایک ہدایت نامہ بھی مرتب کیا ہے، انہی کے بھائی مرزا خیر اللہ تھے جو رصدگاہ دہلی میں راجہ جے سنگھ کے برائے نام نائب اور عملاً رصدگاہ کے متولی تھے، اسی رصدگاہ کے ایک اور کارکن مولانا عابد دہلوی تھے، ان کی تصانیف میں سے ان کا رسالہ فی استخراج اوساط علویہ بادِ حوادث کے جھونکوں سے بچ کر رضا لائبریری رامپور میں باقی رہ گیا ہے[1]۔

کرنل ٹاڈ کی تقلید میں فاضل مصنف نے بھی لکھا ہے کہ راجہ جے سنگھ کی موت کے ساتھ سائنس اور ہیئت اس ملک میں ختم ہو گئے، مگر یہ قلت مطالعہ کا نتیجہ ہے، ریاضی وہیئت کی ترقی جے سنگھ کے بعد بھی جاری رہی، اگلی (انیسویں) صدی مسیحی نے ایک عظیم فاضل کو پیدا کیا، یہ مولانا غلام حسین جونپوری ہیں جنھوں نے علم ہیئت اور متعلقہ ریاضیاتی علوم پر ایک انتہائی ضخیم کتاب "جامع بہادر خانی" کے نام سے تصنیف کی، یہ محض اپنے پیش رؤں کی خوشہ چینی ہی پر مشتمل

---

[1] نزہۃ الخواطر: الجزء السادس، ص ۳۴۷، نیز فہرست کتب عربی قدیم رضا لائبریری، رامپور فن ہیئت، ص ۴۲۴۔

نہیں ہے، بلکہ ان کی ذاتی دریافتوں پر بھی حاوی ہے، جامع بہادر خانی ۱۸۳۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ میں رصدگاہ قائم کرنے کی تحریک شروع ہوئی، کام شروع بھی ہوا، آلات منگائے گئے، مگر بدانتظامی کی وجہ سے منصوبہ اختتام کو نہ پہونچ سکا پھر غدر ہوگیا، نئے حکمرانوں کو محکوموں کی ثقافت سے کوئی ہمدردی نہ تھی، وہ تو اسے نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے، پھر بھی مدارس عربیہ کے معلمین و متعلمین کی تعلیمی سرگرمیوں کے طفیل میں اور کچھ نہیں تو اس کا کم از کم نام تو باقی رہ گیا، والی اللہ المشتکی۔

رہی مسلم علم الہیئت کی عظمت تو خود مسلمانوں نے تو اس باب میں کوئی بلند یا پست دعویٰ نہیں کیا، البتہ غیر جانبدار اور منصف مزاج غیر مسلم محققین نے بڑے شاندار الفاظ میں اسے خراج تحسین ادا کیا ہے، مثال کے طور پر کارادی دو عرب (مسلم) فضلائے ریاضی و ہیئت کے علمی کمالات کے بارے میں لکھتا ہے:

"مسلمانوں نے سائنس کے اندر واقعی بڑے عظیم کمالات حاصل کئے، انھوں نے اعداد کی ترقیم کا طریقہ سکھایا، اگرچہ وہ ان کی ایجاد نہیں تھا، اور اس طرح وہ روزانہ زندگی کے علم الحساب کے بانی بن گئے، انھوں نے علم الجبر والمقابلہ کو ایک تحقیقی علم بنا دیا اور اسے بہت زیادہ ترقی دی، نیز ہندسۂ تحلیلی کی بنیاد ڈالی، اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ علم المثلثات مستوی و کروی کے بانی وہی ہیں، جن کا سچ تو یہ ہے کہ یونانیوں کے یہاں وجود بھی نہیں تھا، علم الہیئۃ میں بھی انھوں نے بہت سے قیمتی مشاہدات کئے۔"[1]

اسی طرح مشہور مورخ ریاضیات کاجوری نے لکھا ہے:

[1] Arnold: Legacy of Islam. p. 397

"ہمیں عربوں کے یہاں ایک قابل تعریف علمی سرگرمی نظر آتی ہے، خوش قسمتی سے انھیں علم دوست حکمراں ملے تھے، جنھوں نے اپنی شاہانہ نوازشوں سے علمی تحقیقات کو ترقی دی، خلفاء کے دربار میں اہل علم اور سائنس دانوں کے لئے کتب خانے اور رصدگاہیں موجود رہتی تھیں، عرب (مسلمان) مصنفین کی کاوش فکر سے تصانیف کی ایک کثیر تعداد ظہور میں آئی، کہا جاتا ہے کہ عرب عالم تو ضرور تھے، مگر عبقری نہیں تھے، لیکن اب جو معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں، ان کے پیش نظر اس قسم کے تبصروں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، انھیں (مسلمان فضلاء کو) بہت سے قابل اعتناء کمالات کا شرف اولیت پہونچتا ہے، انھوں نے تیسرے درجہ کی مساواتوں کو ہندسی اعمال کے ذریعہ حل کیا، علم المثلثات کو ایک نمایاں حد تک مکمل کیا، ان کے علاوہ انھوں نے ریاضیات، طبیعیات اور فلکیات کے اندر بھی بے شمار اضافے کئے۔"[1]

دوسری جگہ یہی مصنف خصوصیت سے ان فلکیاتی مساعی کے بارے میں رقمطراز ہے:

"ان وجوہ کی بنا پر (ان علوم کے اندر مسلمان ہیئت دانوں کے یہاں) بہت زیادہ ترقی ہوئی، ہیئتی جداول (زیجوں) اور آلات رصدیہ کی اصلاح کی گئی، رصدگاہیں تعمیر کی گئیں اور فلکیاتی مشاہدات کے پیہم سلسلوں کی رسم جاری کی گئی۔"[2]

خود فاضل مصنف نے مسلمان ہیئت دانوں کی فلکیاتی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا ہے:

"قرون وسطیٰ میں مسلمان اپنے زمانہ کے عظیم ترین ہیئت داں تھے، انھوں نے بطلیموسی

[1] F. Cajori: History of Mathematics. Ph. 111.112

[2] F. Cajori: History of Mathematics. Ph. 102

نظام ہیئت کے اساسی اصول تسلیم کر لئے تھے، وہ اعتدالین کی تصحیح سے واقف تھے، انھوں نے اوجِ شمس کی حرکت کو بھی معلوم کرلیا تھا، نیز منطقۃ البروج کے میلان (میں کمی کی مقدار میں) تفاوت کا بھی پتہ چلا لیا تھا، انھوں نے اس مسئلہ پر بھی بحث و تمحیص کی تھی کہ آیا زمین اپنے محور پر گھومتی ہے، مگر عموماً اس نظریہ کو مسترد کر دیا تھا، انھیں باقاعدہ اصولی طور پر مشاہدات فلکی کرتے رہنے کی ضرورت کا پورے طور پر احساس تھا، عملی علم الہیئت میں وہ اپنے زمانہ کے ہندو اور یورپی ہیئت دانوں سے کہیں آگے تھے "

ظاہر ہے ایک جاندار علمی نظام جو چودہ سو[۱۴۰۰] سال تک (بلکہ دو ہزار تین سو سال تک کیونکہ مسلمانوں کی فلکی سرگرمیاں یونانی علم الہیئت کی تجدید تھیں) متمدن دنیا کے علمی حلقوں پر چھایا رہا ہے اور جس نے قدم قدم پر اپنی نظریاتی و مشاہداتی پیچیدگیوں کا حل دریافت کیا ہے، راجہ جے سنگھ جیسے محب فن ماہر فن کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ "باقی"

مقالات سلیمان (حصہ دوم)

مقالات سلیمان کی فنی اعتبار سے ازسرنو ترتیب و اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے، یہ ان کا دوسرا حصہ ہے، اس میں مولانا سید سلیمان ندوی جانشین شبلی کے علمی و تحقیقی مضامین .... الندوہ لکھنؤ اور معارف اعظم گڈھ سے اکٹھا کئے گئے ہیں، جن میں ان کے معرکۃ الآراء تحقیقی مضامین، مثلاً ہندوستان میں علم حدیث، واقدی، کتب خانہ اسکندریہ، کیا مرزا بیدل عظیم آبادی نہ تھے، کے علاوہ، جو ان کی تلاش و تحقیق کا شاہکار ہیں، ایک اہم مضمون اسلامی رصدخانوں پر بھی ہے، جو اس موضوع پر اردو زبان میں سید صاحب کے قلم سے پہلا مضمون ہے۔

قیمت :- ۱۷ — ۰ — ۰

امیر خسروؒ کی صوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۴)

امیر خسرو نے خواجگانِ چشت کے مسلک ہی کو اپنا کے اپنے دل کے اندر عشق کی آگ بھڑکائی، اُن کے مرشد کی نصیحت بھی تھی، کہ عشق انگیز کلام کہا کرو، جیسا کہ سیر الاولیاء کے حوالے سے پہلے ذکر آیا ہے، (سیر الاولیاء ص ۳۰۱) اس کو انھوں نے انتہائے کمال تک پہونچا دیا، وہ اپنی شاعری خصوصاً اپنی غزلوں میں تصوف کے رموز و نکات میں سب سے زیادہ زور عشق یعنی عشقِ الٰہی پر دیتے ہیں، جس کے سوز سے اُن کا سینہ بھی ایک آتشکدہ بنا رہا، اسی لئے اُن کے اشعار میں اس کی چنگاریاں بھڑکتی نظر آتی ہیں، اسی کی بدولت اُن کے مرشد نے ترک اللہ یعنی اللہ کا معشوق کہا ہے، ذیل میں ہم اُن کے ایسے زیادہ سے زیادہ اشعار اُن کے مطالب کے ساتھ پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے قلبی واردات کے ساتھ ان کے مسلکِ عشق کا صحیح اندازہ ہو جائے، اُن کے مطالب کی وضاحت کے بعد کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں،

(۱) میرے دل کے ویرانے میں تیرے عشق کا خزانہ پوشیدہ ہے، اسی شعلہ سے ہمیشہ میری روح میں آگ بھڑکتی رہتی ہے،

گنجِ عشقِ تو نہاں شد در دلِ ویرانِ ما　　　می زند زاں شعلہ دائم آتشے در جانِ ما

(۲) ہم اپنے کو تیرے ہی عشق کے غم سے ہم آہنگ بناتے ہیں، پنہاں طریقے سے تیرے ہی عشق سے کھیلا کرتے ہیں،

با غمِ عشقِ تو می سازیم ما — با تو پنہاں عشق می بازیم ما

(۳) میرا دل عاشقی میں پریشان ہو کر پریشان تر ہوتا گیا، عشق میں دل جاتا رہا، تو میرا بدن مجبور ہو کر مجبور تر ہوتا گیا،

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا — تنم از بیدلی بے چارہ شد بے چارہ تر بادا

(۴) عشق نے میری روح کی خاطر مجھ کو گرفت میں لے لیا ہے، اس کے بعد میری زبان بھی گرفت میں آگئی ہے،

عشق از پے جاں گرفت ما را — حلقے بزباں گرفت ما را

(۵) عشق کی وجہ سے رو بھی نہیں سکتا، پھر کیا کہوں؟ یہ وہ بھری کشتی ہے جس کو بارش کی ضرورت نہیں،

بہ عشق از گریہ ہم ماندم چہ گویم — پر از کشتی کہ باراں نیست اورا

(۶) میں نے اپنی روح سے عاشقی کی پیوندکاری کر دی ہے، اب روح تو جا چکی لیکن وہ پیوند باقی ہے،

بجاں پیوند کردم عاشقی را — کنوں جاں رفت و آں پیوند ماندہ است

(۷) عشق کے سینہ کے اندر روح کی گنجایش نہیں، اس میں غم کی بھی گنجایش نہیں، یہ بھی اسی میں سے ہے،

نگنجد جاں دروں سینۂ عشق — نہ گنجد غم کہ او ہم زاں خویش ست

(۸) تیرا عشق ایک بلا ہے مگر روح کو یہی پسند ہے، تیرے دہن سے ایک بار کی ہنسی پسند ہے،

عشقِ تو بلائے جاں پسند ست — یک خندہ ازاں دہاں پسند ست

(۹) ہر گروہ کے لئے ایک دین ہے، مگر میرا دین عاشقی ہے، اور تمام چیزوں سے بے خبر رہنا میرا مسلک ہے،

ہر گروہے بگزیدند بہ عالم دینے — عاشقی دینِ من و بے خبری کیشِ من ست

(۱۰) عشق میری روح کے ساتھ ہی باہر نکلے گا، یہ نہ سمجھ کہ یہ تعویذ اور جادو کے ذریعہ سے نکلے گا،

عشق با جان ہم از سینہ بروں خواہد رفت — تا ندانی کہ بہ تعویذ و فسوں خواہد رفت

(۱۱) عشق میری روح میں آکر سما گیا ہے، اور میرے دل کے گھر کو خراب کر رکھا ہے، میرے جیسے سوختہ دل کے لئے یہی جنون ہے،

عشق بنشست بجان خانۂ دل کرد خراب — کہ منِ سوختہ را بہ سر ایں سودا داشت

(۱۲) جب تک یہ بندہ زندہ رہے گا، غمِ عشق روح میں سمایا رہے گا، اور میرا سر اس سرو رواں یعنی معشوق کی راہ کی خاک رہے گا،

تا زید بندہ، غمِ عشق بجاں خواہد داشت — سر بہ خاکِ رہ آں سرو رواں خواہد داشت

(۱۳) تیرے عشق کا بوجھ میرے دل کے لئے بہت خوشگوار ہے، میرا کام عشق کرنا ہے، اور یہ بہت اچھا کام ہے،

بارِ عشقت بر دلم بارے خوش ست — کارِ من عشق است و ایں کارے خوش ست

(۱۴) عاشقوں کے لئے وہی زخم اچھا ہے، جس کو مرہم نہ ملے، بیدلوں کی پرنم آنکھ ہی اچھی ہوتی ہے،

عاشقاں را زخم بے مرہم خوش ست — بیدلاں را دیدۂ پُرنم خوش ست

(۱۵) وصال کے بعد عشق کی لذت باقی نہیں رہتی، اہلِ عشق کے لئے جدائی ہی اچھی چیز ہے،
ادنیٰ چیزوں کے عشق سے خسرو اپنے دماغ کو باز رکھ، ہجر خدائی کے ساتھ ہی عشق اچھا ہوتا ہے،

نیست لذت عشق را بعد از وصال — عشق بازاں را جدائی خوشتر است
عشقِ دوناں خسروا از سر بنہ — عشق بر ہجر خدائی خوش تر است

(۱۶) ساقی! شراب لا! کیونکہ دل عشق سے ایسا جل گیا ہے کہ اس کباب کے جلنے کی بو
گھر گھر پھیلی ہوئی ہے،

ساقی! بیارمے کہ چناں سوخت دل زعشق — کز سوز ایں کباب ہمہ خانہ بوگرفت

(۱۷) جو آدمی عشق نہیں کرتا ہے، وہ آدمی نہیں پتھر ہے، اور جو آدمیت کے رنگ میں ہے،
وہ یقیناً عشق کی تمام بلاؤں کو برداشت کرتا ہے،

کسے کہ عشق نبازد نہ آدمی سنگ است — بلائے عشق کشد ہر کہ آدمی رنگ است

(۱۸) اس خیال سے کیا نقش بنا سکتے ہو جو عشق کی کیفیت سے خالی ہے، ایسے آئینہ میں کیسے
چہرہ دیکھ سکتے ہو، جو زنگ سے بھرا ہوا ہے،

چہ نقش بندی از اندیشۂ کہ بے عشق است؟ — چہ روے بینی از آئینۂ کہ در زنگ است؟

(۱۹) عشق اگرچہ بدبختی کا نشان ہے لیکن عاشق کے خیال میں یہی اس کے لئے ابدی
سعادت کا ذریعہ ہے جو معشوق سے کوئی مراد چاہتا ہے، تو پھر یہ کیسے کہ وہ اپنی مراد کا عاشق ہے
اگرچہ عاشقوں کے لئے سیکڑوں دن اچھے ہوں لیکن اس کے لئے بہترین دن وہ ہے جب وہ
کسی بُرے دن میں مبتلا ہو جائے،

عشق اگرچہ نشان بخت بدست — نزدِ عاشق سعادتِ ابدست
ہر کہ جوید مرادے از معشوق — گوئی او عاشق مراد خودست

گرچہ صد روز نیک عاشق راست — بہتریں روز اسیر روز بدست

(۲۰) تیرے عشق سے میرا دل خون، جگر فگار، اور روح برباد ہوگئی ہے، خدایا میری
چشم خونیں کہاں تیرے چہرے پر پڑ گئی،

شد از عشقت دلم خون و جگر افگار و جاں برباد
کجا یا رب مرا ایں چشم خونیں بر رخت افتاد

(۲۱) تم یہ خیال کرتے ہو کہ میں عاشقی میں دیوانہ ہو جاؤں گا، اگرچہ رسوائی کی وجہ
سے دنیا میں افسانہ ہی کیوں نہ بن جاؤں، عشق بازی کا نعرہ خود پرستوں کے لئے بہت ہی
زیبا ہے، جب میں عشق سے آشنا ہو جاؤں گا، تو اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاؤں گا،

چہ پنداری کہ من از عاشقی دیوانہ خواہم شد؟
ز رسوائی اگرچہ در جہاں افسانہ خواہم شد
زبس زیباست لافِ عشق بازی خود پرستاں را
چو با عشق آشنا گشتم ز خود بیگانہ خواہم شد

(۲۲) میں عشق میں مر مٹوں گا، کیونکہ اس وادی میں جہاں لاکھوں قافلے گم ہو گئے،
ایک آدمی کیسے جانبر ہو سکتا ہے، مسکین عاشقوں کے لئے اُن کے مقصود کا دروازہ کیسے کھل
سکتا ہے، جب کہ اُن کے معشوقوں کے دروازے کی خاک میں اُن کے بخت کے قفل کی کنجی گم
ہو گئی ہے، آخر کب تیرا قدم ان مسکینوں کا حال دیکھنے کے لئے بڑھے گا، عاشق تو خاک
ہو چکا ہے، اور اُس کی روح خاکدان میں گم ہو گئی ہے،

من اندر عشق خواہم مرد کے جاں می برد ہر کس؟
از آں وادی کہ در وے صد ہزاراں کارواں گم شد

در مقصود بر عشاقِ مسکیں باز کے گردد؟

چو در خاکِ درِ خوباں کلید بختِ شاں گم شد

قدم تا کے و دریغ اختر کنوں از حالِ مسکیناں

کہ عاشق خاک گشت و جانش اندر خاکداں گم شد

(۲۳) میں نے عشق اور عاشقوں کے مذہب میں نام پیدا کیا ہے، اگر میرے سر کو دار پر چڑھا دیا جائے تو میں منصور ہو جاؤں،

در عشق علم کردم و در مذہبِ عشاق

منصور شوم گر بہ سرِ دار بر آرید

(۲۴) عشق کی بات اس تک اس طرح پہونچی ہے، کہ معشوق کے ہاتھ سے سیکڑوں بلاؤں کے تیر مارے گئے، مگر تکلیف محسوس نہیں ہوتی،

آں راسخنِ عشق رسد کو بدل از دوست صد تیر بلا گنجد و آزار نہ گنجد

(۲۵) اگر کوئی عاشقی سے بیزار ہو تو اس کی عبادت بیکار ہو جائے گی،

کسے کز عاشقی بیزار باشد اگر طاعت کند بیکار باشد

(۲۶) عشق کی راہ میں کس طرح سلامتی کی گنجایش ہو سکتی ہے، اس راہ میں سونا اور کھانا پینا بھی محال ہے،

بہ راہِ عشق سلامت چگونہ در گنجد زہے محال کہ در شوق خواب و خور گنجد

(۲۷) عاشق اپنی روح کو سینہ سے اس لئے باہر کر دیتا ہے تاکہ تیرے غم کو روح کی طرح سینہ میں رکھ لے،

عاشق از سینہ جاں برد تا غمت را بہ جاں دروں گیرد

(۲۸) اگرچہ عشق میں پختہ نہ ہو سکا، پھر بھی دود و الم سے جان سوختہ ہو گیا،

پختہ نہ شدم ز عشق ہر چند جاں سوختہ شد ز دود و الم

جذبۂ عشق الٰہی سے دل کے اندر جو روحانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، اُن کی عکاسی بھی امیر خسرو نے کی ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ خود اُن کے دل کے اندر عشقِ الٰہی کی جو جلوہ نمائیاں رہیں، ان ہی کو وہ مختلف پیرایے میں بیان کرتے رہے، تو یہ صحیح ہوگا،

(۲۹) کہتے ہیں میرے دل کے اندر درد بھرا ہوا ہے، دوستو، اس کا کوئی علاج نہیں، میں ہوں اور تیرا درد ہے، اس لئے کہ تو خود میرے دل کا علاج نہیں چاہتا ہے،

مرا دردیست اندر دل کہ درماں نیستش یارا

من و دردت چو تو درماں نمی خواہی دلِ ما را

(۳۰) اے طبیب ہم کو اپنے حال پر چھوڑ دے، میرے درد کا علاج، اُس وقت تک مت ڈھونڈھ جب تک میرا معشوق اپنی مہربانی سے خود میرا علاج نہ کرے،

اے طبیب از ما گذر درمانِ دردِ ما مجوے،

تا کند جانانِ ما از لطفِ خود درمانِ ما

(۳۱) میرے دل کو غم کے ہاتھوں امان نہیں ہے، اسی لئے دنیا میرے لئے شادمانی ہے،

دلِ ما از دستِ غم اماں نیست نشانِ شادمانی در جہاں نیست

(۳۲) میری عقل کے لئے میرا عشق بلا تھا، لیکن میرے لئے یہ بلا ہے کہ اب عشق سے امان حاصل نہیں،

بلائے عقل عشقم بود اکنوں بلا ایں شد کہ از عشقم اماں نیست

(۳۳) دل کی آنکھ کو بلا میں ڈال دیا ہے، اگر اس کو ظاہر میں دیکھنا چاہتا ہو،

تو دل اور آنکھ کے درمیان خون کی موجیں اٹھتی دکھائی دیتی گی،

دیدہ دل را اور بلا افگند و خواہی دیدہ فاش

درمیانِ دیدۂ و دل موجِ خوں خواہد گذشت

(۳۴) خسرو ہے، سوز دل نہیں ہے، ذوق عالم سے بے خبر ہے، آگ کھانے والے پرندہ کو دانہ کھانے میں کیا لذت مل سکتی ہے،

خسرو ست نہ سوز دل و ز ذوق عالم بے خبر — مرغ آتش خوارہ کے لذت شناسد دانہ را

(۳۵) سوختہ دل عاشق زندہ تو رہتا ہے، لیکن اس کی روح دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس دنیا کی خبر اس کو نہیں رہتی ہے، اس کی دنیا دوسری ہوتی ہے،

عاشقِ سوختہ دل زندہ بجانِ دگر است

زیں جہانش چہ خبر کو بہ جہانِ دگر است

(۳۶) دل گرفتار عشق ہے، جگر خستہ ہو رہا ہے، اور بدن تکلیف میں اب تک ہے، معلوم نہیں اس مسکین کے سر پر کیا خرابیاں آئیں گی،

دل گرفتار و جگر خستہ و تنِ زار ہنوز — تا چہا بر سرِ مسکینِ زبوں خواہد آمد

(۳۷) اگر میں کہوں کہ میرے دل کے اندر کیا پوشیدہ ہے تو تو خود کہہ دیگا اور جان لیگا کہ ہجر کا غم کیا ہوتا ہے،

گر بگویم کہ درونِ دلِ من پنہاں چیست — خود بگوئی و بدانی کہ غمِ ہجراں چیست

(۳۸) اے میرے اللہ، میرے دل چاک کے اندر وہ ہنستا ہوا پھول یعنی معشوق کیا ہے؟ میرا چمکتا ہوا چاند (یعنی معشوق) میرے ہجر کی رات میں کیا ہے؟

یارب اندرونِ دل چاکم آں گُل خنداں چو نست — ماہِ تابانِ من اندر شبِ ہجراں چو نست

(۳۹) وہ وقت کیا اچھا تھا کہ میرا دل بے غم تھا عشق کے وسوسہ سے خالی تھا، اب دل نہیں رکھتا ہوں، تو غمِ جاناں کیا کھاؤں گا، اس سے پہلے غم تھا تو دل بھی تھا،

اے خوش آں وقت کہ ما را دلِ غم بود ست — خاطر از وسوسۂ عشق فراہم بود ست

دل ندارم غمِ جاناں ز چہ تنہا غم خورد — پیش ازیں گرچہ غمے بود دلے ہم بود ست

(۴۰) میری آنکھوں میں نہ نیند ہے نہ میرے ہاتھ میں دل ہے، میری آنکھ اور میرا دل دونوں تیرے رخسار کے آشفتہ اور مست ہیں،

نہ مرا خواب بچشم نہ مرا دل در دست — چشم و دل ہر دو بر رخسار تو آشفتہ و مست

(۴۱) سیکڑوں دل اس سیاہ رات کی طرح زلف کی وجہ سے جل گئے ہیں، اس طرح جیسے رات کو چراغ جل رہے ہیں،
یہ دل شمشیر جفا سے پھٹ کر رہ گیا ہے، اس کے مژہ کے تیر سے چھلنی ہو گیا ہے،

صد دل اندر زلفِ شب گوں سوختہ است — گوئیا در شب چراغ افروختہ ست

دل بہ شمشیرِ جفا بہ شگافتہ است — واں کہ از تیرِ مژہ بر دوختہ ست

(۴۲) میرے دل کے درد کا علاج طبیب کے پاس نہیں، میرے ٹکڑے ٹکڑے زخم کے لئے کوئی مرہم نہیں جانتا ہے،

درد دلم را طبیب چارہ ندانست — مرہم این ریش پارہ پارہ ندانست

(۴۳) اے دلِ غمگیں ست ہو کہ معشوق مل ہی جائیگا، تشنہ لبوں کو آب حیات مل ہی جاتا ہے،

اے دل غمگیں مباش کہ جاناں رسیدنی ست

در کامِ تشنہ چشمۂ حیواں رسیدنی است

(۴۴) وہ دل جو جسم کے اندر بری خواہشوں سے گھرا ہوا ہے، وہ دل نہیں ہے، وہ دل کیا جس کے اندر اصل معشوق پر نقاب پڑا ہوا ہو۔

ہر دل کہ در تنے بہ ہوائے مقیداست
دل نیست کہ شاہدے اندر نقابہ است

(۴۵) میرا خون اگر میرے رخسار کا ماجرا ہو جائے تو اس کا مطالعہ لطف سے کرنا چاہیئے، کہ یہ میری وفا کا دیباچہ ہے،

زخونِ دل کہ برخسار ماجرائے منست
بخواں بلطف کہ دیباچۂ وفائے منست

(۴۶) میرا دل میرے عشق کا محرم نہیں ہے، وہ عشق سے بے گانہ ہے، ہمدم نہیں ہے،

مرا بہ عشق دلِ خویش نیز محرم نیست
کہ می زند دمِ بیگانگی و ہمدم نیست

(۴۷) ایسا دل کہاں ہے کہ اس کے غم کو پوشیدہ رکھتا، وہ صبر کرتا اور اس کے اندر سمائے رہتا،

کجاست دل کہ غمت را نہاں تواند داشت
بہ صبر کوشد و خود در اماں تواند داشت

(۴۸) آجا کہ تیرے بغیر میرا دل خون میں غرق ہے، اب مجھ میں طاقت باقی نہیں ہے، اور نیند بھی حرام ہے،

بیا کہ بے تو دل خستہ غرقِ خونابست
مرا نہ طاقتِ صبر نہ زہرہ خوابست

(۴۹) دل نے اس کے چہرہ کے کعبہ کو طلب کیا، اور اس کی زلفِ پریشاں کے حلقہ میں پھنس کر رہ گیا،

دل طلبِ کعبۂ روئے تو کرد
حلقۂ آن زلف پریشاں کرد

(۵۰) تیرے عشق میں میرا دل خون، جگر زخمی اور روح برباد ہو کر رہی، اے اللہ میری یہ خونیں آنکھیں کہاں تیرے رُخ پر جا پڑیں،

شد از عشقت دلم خون و جگر افگار و جاں برباد
کجا یارب مرا ایں چشمِ خونیں بر رخت افتاد

(۵۱) وہ دل کس کام کا ہے جس میں تیرا گھر نہ ہو، اور وہ زلف کس لئے دل سنوارے جس میں تیرا گھر نہ ہو،

آں دل بہ چہ کار آید کاں خانۂ تو نبود
واں موئے چہ بندد دل گر خانۂ تو نبود

(۵۲) میں عشق کا جلایا ہوا ہوں، اگر اے دل تو میری سانس ہے، اس جلی ہوئی چیز سے آخر آگ بھڑک اٹھے گی،

من سوختۂ عشقم تو دمِ و میم اے دل
ایں سوختہ را آخر آتش ہم ازیں خیزد

(۵۳) عاشق کا دل اپنے معشوق کا شیدائی کیوں نہ ہو، وہ اپنے اس عشق سے دنیا میں رسوا نہ ہو گا،

دلِ عاشق چرا شیدا نباشد
بہ عشق اندر جہاں رسوا نباشد

(۵۴) میرے دل کو میری روح سے صبر حاصل نہیں ہو سکتا، اور اگر روح سے صبر ہو جائے تو یہ صبر دراصل روح سے نہ ہو گا،

دلِ ما را شکیب از جاں نباشد
ور از جاں باشد از جاں نباشد

(۵۵) تیرے ایسا دلدار نہ ہو تو اہلِ عشق کے نزدیک ایسے دل کی کوئی قدر نہیں،

دلے کو چوں تو دلدارے ندارد
بر اہلِ عشق مقدارے ندارد

(۵۶) اے اہلِ دل پہلے اپنی روح سے اپنی روح کو آزاد کر لے، پھر اس دل لینے والے

کے رُخ پر نظر ڈال

اے اہلِ دل نخست ز ترکِ جاں کنند
واں گہ نظارۂ رُخِ آں دلستاں کنند

اور پھر دل پر پوری ایک غزل کہدی ہے ؛

رستہ بودم چو من چند گہ از زاریِ دل
از نمکدانِ تو شد تازہ جگر خواریِ دل

اے میرے چاند! کچھ دیر کے لئے دل کی تکلیف سے آزاد ہو گیا تھا، لیکن تیرے نمک چھڑکنے سے میرے دل کی جگر خواری تازہ ہو گئی

تو ہمی آئی و صد غارتِ جاں از ہر سو
در چنیں فتنہ کجا صبر کند یاریِ دل

تو میرے پاس آتا ہے لیکن ہر طرف سے میری روح کی سیکڑوں قسم کی غارت گری ہوتی ہے، ایسے فتنہ سے دل کو صبر کہاں سے آئے،

ہر کسے با دلِ آزاد از یں شہر گذشت
من گرفتار بماندم بہ گرفتاریِ دل

اس آبادی سے ہر شخص آزاد دل لے کر گذر گیا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں گرفتار رہا

دل گنہ کرد کہ عاشق شد و نزدِ خوباں
نشود عفو ہمہ عمر گنہ گاریِ دل

دل نے یہ گناہ کیا کہ یہ عاشق ہو گیا، مگر معشوقوں کے نزدیک دل کی گناہگاری کی معافی تمام عمر نہیں کی جاتی ہے،

وقتے افگن نظرے جانبِ من اے خورشید
کہ سیہ روے بماندم ز شبِ تاریِ دل

اے میرے آفتاب یعنی معشوق میری طرف بھی کچھ دیر کے لئے نظر کر، کہ میں اپنے دل کی رات کی تاریکی کی وجہ سے سیہ رو ہو رہا ہوں،

وقت آنست کہ دست دہی اے دوست بہ لطف
کہ فرو رفتم در گلِ ز گراں باریِ دل

اب وقت آگیا ہے کہ اے دوست مجھ کو سہارا دے کیونکہ میں اپنے دل کی گراں باری کی وجہ سے مٹی میں مل گیا ہوں،

عشقت افگند میانِ من و دل بیزاری
بر رُخ از خون نگر آنک خطِ بیزاریِ دل

تیرے عشق نے میرے اور میرے دل کے درمیان بیزاری پیدا کر دی ہے، میرے رُخ پر خون دیکھ کہ یہی بیزاریِ دل کا نشان ہے،

می شود زلفِ تو از آسیبِ نسیمے درہم
بس کہ بے تاب شد از زحمتِ بسیاریِ دل

تیری زلف نسیم کے آسیب سے درہم ہو جاتی ہے، اور یہ نسیم میرے دل کی تکلیف کی زیادتی کی وجہ سے بے قرار ہو گئی،

عشق گویند کہ کارِ دلِ بیدار بود
بہرہ ام خوابِ اجل ز بیداریِ دل

عشق کہتا ہے کہ دل کا اصلی کام بیدار رہنا ہے لیکن میں اس بیداریِ دل سے موت کی نیند سے بہرہ مند ہوا،

اور ان کے اشعار کا لبِ لباب یہ ہے کہ عشق جب ہو تو دل میں ایسا درد پیدا ہو جائے کہ پھر اس کا کوئی علاج نہ ہو، دل اور آنکھ کے درمیان خون کی ندیاں بہتی رہیں، دنیا میں اس کے لئے شادمانی نہ ہو، ایسے سوختہ دل عاشق کی روح دوسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر اسی سوزِ دل سے اس کو روحانی مسرتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں،

عشق پر بھی پوری ایک غزل کہدی ہے، ذرا پہلے اس کے اشعار سے ناظرین لطف اندوز ہوں

اے ز سودائے تو در دل رونقِ بازارِ عشق
مرہمِ جانہاست از یاد لبت آزارِ عشق

دیر کہ می رفتی بہ پیشِ عاشقاں غمزہ زناں
دیگر آں بسمل شدند و من شدم مردارِ عشق

من بداں نذرم کہ گر میرم بسوزم مبتگری
بیں کہ چوں من چند کس مردست در بازارِ عشق

تیغ خود بگذار تا دامِ تو بگذارم ازانک
دامِ معشوق است سر برگردنِ عیارِ عشق

از دعایت من چو اے زاہد نگشتم نیک بخت
تو بیا بارے چو من بدبخت شو در کارِ عشق

آں کہ بیداریش بہ خوابِ خوش باشاہد است
شاہدش داں آں کہ حق است ایں چنیں بیدارِ عشق

خسروا با جان و دل ہم قصۂ جاناں مگوے
زاں کہ نتواں گفت با نامحرماں اسرارِ عشق

اس غزل میں یہ پیام ہے کہ جنونِ عشق الٰہی سے عشق میں رونق پیدا ہوتی ہے، عشق کا آزار روح کا مرہم ہے، عشق کی راہ میں بسمل بننے کے بجائے فنا ہو جانا بہتر ہے، سوزِ عشق میں مرجانا عشق کی کامرانی ہے، عشق کی کسوٹی یہ ہے کہ اس پر معشوق ہر حال میں چھایا رہے، زاہد کی نیک بختی اس میں ہے کہ وہ عشق کی راہ میں بدبخت ہو جائے، معشوق سے وصل کی نیند کے بجائے عشق کی بیداری زیادہ بہتر ہے، عشق کا راز یہ ہے کہ اس کے اسرار نامحرموں حتی کہ روح اور دل سے بھی نہ بیان کئے جائیں،

اوپر امیر خسرو کے جتنے اشعار عشق پر نقل کئے گئے ہیں، ان سے ان کی روحانیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اُن کے نزدیک عشق یعنی عشقِ الٰہی ایسا ہو جو آگ کی طرح روح میں شعلہ زن ہو، غم عشق نئی زندگی پر چھایا ہو، زندگی کی ساری لذت عشق کے کھیل ہی میں محسوس ہو، اس میں جتنی پریشانیاں بڑھتی ہیں، وہ اور بھی پُرکیف ہوتی جاتی ہیں، عشق کے ہاتھوں روح گرفتار رہے، اور زبان گونگی بن کر رہ جائے، عشق کے آزار میں آنکھیں اشکبار رہیں، لیکن اُن سے آنسو ٹپکنے نہ پائیں عشق ایسا ہو کہ اس میں روح یا غم سمانے کی کوشش کرے، تو ان کی گنجایش نہ ہو، عشق ہی دین بن کر رہے، عشق جنون کی حد تک ہو، عشق میں وصل کی فکر نہ ہو، ہجر ہی میں عشق کی لذت ہے، عشق میں دل خونبار، جگر نگار اور روح برباد ہو، یہی عشق کی کامرانی ہے، عشق کا راز اس میں ہے کہ عاشق خاک اور اس کی روح خاکدان بن جائے، غم عشق میں روح پر بے خبری چھائی ہوئی ہو، اگر دل پر زخم کاری لگے، تو اس پر مرہم رکھنے کی فکر نہ ہو، بلکہ دل کباب کی طرح جلتا رہے، اگر دل میں عشق نہیں تو وہ آدمی کا دل نہیں بلکہ پتھر ہے، عشق سعادت ابدی کا ذریعہ ہے، عشق کسی مطلب برآری کی خاطر نہ ہو، عشق میں معشوق سے مراد کا طلبگار ہونا گویا مراد سے عشق کرنا ہے، جو عشق سے آشنا ہوگا، وہ اپنے سے بیگانہ رہیگا، عشق کی اصلی کامیابی منصور بن کر دار پر چڑھ جانا ہے، اگر کوئی عشق سے بیزار ہے تو اس کی ساری عبادت و ریاضت بھی بیکار ہے، عشق میں وہی پختہ ہوگا، جو سوختہ جان ہوگا، عشق کا راز ایسا پوشیدہ رہے کہ اس کی خبر روح اور دل کو بھی نہ ہو،

عشق کی نیرنگیاں دکھانے میں خسرو کبھی پسپا ہو کر نا امید ہو جاتے ہیں، تو دردِ عشق کا علاج نہیں چاہتے، بلکہ سوزِ عشق میں مرجانا عشق کی کامرانی سمجھتے ہیں،

.... اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ عشق کی اصلی کامیابی یہ ہے کہ منصور ہو کر دار پر چڑھ جائے تو وہ گویا وحدت الوجود کے قائل ہو کر وحدت الوجود کی ترویج کرتے ہیں، اُن کے یہاں عشق کی جو سرشاری ہے، اسی کا نام وحدت الوجود ہے جس کو انھوں نے

فلسفیانہ انداز کے بجائے عارفانہ اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے، پھر اسی سرشارانہ رنگ میں یہ بھی کہہ اٹھے ہیں،

ع :- کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

اس کو ان کی بیگانگی از مذہب محمول نہیں کیا جا سکتا ہے، در اصل اُن کے عشقِ الٰہی کا ایک نعرۂ مستانہ ہے، اُن کے یہاں عشق کا وہی تصور اور تخیل ہے، جو خواجگانِ چشت کے یہاں رہا، گذشتہ صفحات میں حضرت فریدالدین گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے جو تصوراتِ عشق ہے ان کا ذکر آیا ہے، ان بزرگوں نے اجمالی حیثیت سے جو کچھ کہا تھا، اسی کو امیر خسروؒ اپنے اشعار میں دلکشی، پُرکیف اور موثر انداز میں پیش کرتے رہے،

امیر خسرو کے یہاں عشق و عقل کی آویزش بھی دکھائی دیتی ہے لیکن اُن کے یہاں عشق کی سرشاری کی اتنی فراوانی ہے، کہ عقل اُن کے عشق کے پنجے میں دب کر رہ گئی ہے، وہ ہر حال میں عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ

دلے دارم کہ ماندہ ست از پئے عشق — خرد جوئی برائے آن نماندہ ست

میں ایسا دل رکھتا ہوں جو عشق کے پیچھے سرگرداں ہے، اب اس کے لئے عقل کی تلاش باقی نہیں رہ گئی ہے،

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں،

ملامت می کند مارا خرد در عشق ورزیدن
دلِ عاشق کجا قولِ خرد را معتبر گیرد؟

ہم کو عشق کرنے پر خرد ملامت کرتی ہے، مگر عاشق کے دل میں عقل کی بات کب معتبر ہوتی ہے،

وہ عشق کو ایک سلطان قرار دیتے ہیں، اور اپنے کو اس کا غلام سمجھتے ہیں، اور اس غلامی میں عقل کو کوئی درجہ دینا پسند نہیں کرتے ہیں،

من مسکیں غلامِ عشقم اے عقل از سرم بگذر
کہ ایں سلطاں ترا در کارِ خود محرم نمی بیند

میں عشق کا ایک ادنیٰ غلام ہوں، اے عقل میرے سر سے دور ہو جا عشق ایسا سلطان ہے کہ وہ اپنے کام میں مجھ کو محرم کی حیثیت سے دیکھنا نہیں چاہتا ہے،

وہ عشق کی مجلسِ خاص میں عقل کو اجنبی اور غیر سمجھتے ہیں، اس لئے کہتے ہیں کہ

در دل چو بود عشق نہ گنجد خرد و عقل — در مجلسِ خاصِ ملک اغیار نہ گنجد

جب دل میں عشق ہو تو اس میں خرد اور عقل کی گنجائش نہیں، اس مجلسِ خاص میں اغیار کا گذر نہیں۔

وہ عشقِ الٰہی کی سرشاری و شادمانی میں عقل کی مطلق پروا نہیں کرتے،

خوشم با عشقِ تو بے عقل و بے جاں — نہ گنجد درمیاں بیگانہ اے چند

میں تیرے عشق میں خوش ہوں، جس کے بعد بے عقل اور بے روح ہو کر رہ گیا ہوں اب میرے عشق کے درمیان کسی یعنی عقل جیسی بیگانہ کی گنجائش نہیں۔

وہ اس کے قائل تھے کہ عاقلوں کے پاس دل نہیں ہوتا، دماغ ہوتا ہے، مگر عشقِ الٰہی میں مبتلا رہنے والے دماغ کی حکمرانی پسند نہیں کرتے،

دلِ دیوانگاں عاقل نہ گردد — سرِ شوریدگاں ساماں نہ خواہد

عاقل دیوانوں کی طرح دل نہیں رکھتا ہے، شوریدہ سر والے کوئی سروسامان نہیں چاہتے،

وہ عشق کو ایک پہاڑ تصور کرتے ہیں، اس کے مقابلہ میں عقل کو محض پرکاہ قرار دیتے ہیں، اس لئے کہتے ہیں،

عشق راآں کو سپر سازد ز عقل
دفع کوہے را بہ کاہے می کند

کون ہے جو عشق کا سپر عقل کو بنا سکتا ہے، پہاڑ کی مدافعت پرکاہ سے کیسے کی جا سکتی ہے،

وہ تو عشقِ الٰہی کی سرشاری میں نہ صرف دماغ، عقل، بلکہ دل سے بھی بیگانہ ہو کر رہنا پسند کرتے ہیں،

عشق آمد و دل ز دستِ ما برد
تدبیرِ عقل مبتلا برد

(عشق ہوا، دل میرے ہاتھ سے جاتا رہا، عقل کی ساری تدبیریں بھی جاتی رہیں)
عشق و عقل کی آویزش مشہور ہے، فلسفہ کا سارا زور عقل پر صرف ہوتا ہے روحانیت اور تصوف میں ساری کرشمہ سازیاں اور جلوہ آرائیاں عشق کی ہیں، فلسفیوں کے یہاں عقل اصل چیز ہوتی ہے، اُن کے نزدیک یہی تمام موجودات پر محیط ہے، ان کا تو یہ بھی خیال ہے کہ خدا بھی تعقل محض ہے، اور یہ آپ ہی اپنا معروض ہے، پھر موجودہ دور کی ساری سائنسی تحقیقات عقل ہی کے ماتحت ہو رہی ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی عقل کے ذریعہ سے زہرہ، چاند، اور حتی کہ سورج تک پہونچ سکتے ہیں لیکن صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ کائنات کی ساری چیزوں کی تسخیر عقل کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے، انسان ہوا میں اُڑ سکتا ہے، پانی کو قابو میں لا سکتا ہے، آفتاب اور ماہتاب تک پہونچ سکتا ہے، مگر زمان و مکان کے کچھ ایسے اسرار بھی ہیں جن کے رموز اور حقائق تک پہنچنے میں عقل کی پرواز قاصر ہے، انسان اپنی عقل سے مٹی، ہوا، پانی، اور آگ کی ساری خصوصیتیں اور صفتیں اپنی عقل سے

معلوم کر سکتا ہے مگر اس کی عقل یہ نہیں بتا سکتی ہے کہ آخر یہ اربعہ عناصر کس اصلی مادہ سے نکلے ہیں، اسی لئے خضرِ راہ، گلزارِ خلیل، شعلۂ طور، یدِ بیضا، دمِ عیسیٰ اور نورِ محمدی کا احاطہ کرنا عقل و فہم کے لئے ممکن نہیں، انبیا کے ذریعہ سے دنیا میں جو روحانی اور مذہبی انقلاب پیدا ہوا، وہ بھی عقل کی سمجھ میں نہیں آسکتا، یا نالۂ شبگیر اور فغانِ صبح گاہی سے باطن کے جو دروازے کھلتے رہے ہیں، وہ بھی عقل کے ادراک سے بالاتر ہے، لیکن یہ ساری باتیں عشق کے ذریعہ سے سمجھ میں آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی، جہاں عقل تشکیک اور تذبذب پیدا کرتی ہے، وہاں عشق یقینِ محکم پیدا کرتا رہا ہے،

عشق اور عقل کی بحث نظریاتی، تاثراتی اور تجرباتی انداز میں ہوتی رہی ہے، امیر خسرو کے یہاں اگر یہ بحث نظریاتی اور تاثراتی رنگ میں ہے تو اس پر ان کا تجرباتی رنگ بھی غالب رہا ہے انکے پر سوز سینہ میں جو کچھ ذاتی طور پر گزرتا رہا، اس کو وہ اپنے اشعار میں منتقل کرتے رہے، اور یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے، کہ عشق، دل اور عقل کے متعلق انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے سوزِ دل کی چنگاریاں بھی ہیں، جو ان کے مرشد کی صحبت میں اور بھی بھڑک اٹھتی تھیں،

امیر خسرو کے یہاں عشقِ الٰہی کی شیریں دیوانگی ضرور رہی، لیکن کسی حال میں شریعت کا دامن چھوڑنا پسند نہیں کیا، خواجگانِ چشت کا مسلک یہ رہا کہ وجد و حال، ذوق و کیف اور استغراق و تحیر کی کیفیات کیوں نہ ہوں، چاہے انوارِ الٰہی اور احوالِ معرفت سے عالمِ ملکوت و جبروت ہی کیوں نہ تسخیر ہو جائے، کسی حال میں بھی اتباعِ سنت اور احترامِ شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو، خود خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی بھی یہی تعلیم رہی کہ "آنچہ نامشروع است ناپسندیدہ است"، اپنے خواجگان کی طرح یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی مقام سے گرے تو شرع میں گرے اور اگر یہاں سے گر گیا، تو پھر اس کا کوئی ٹھکانا نہیں (فوائد الفوائد ص ۲۴۰)، اسی لئے امیر خسرو نے

بھی اپنی شاعری میں اسی بات کی ترویج کی کہ

ع، بے روشِ مصطفےٰ راہ بر افلاک نیست

ع، شرع اگر عین نباشد شر ست

تصوف انسان کی فضیلت پر بڑا زور دیتا ہے، اس لئے امیر خسرو کی شاعری میں اس فضیلت کو گوناگوں طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان گوہر پاک اور زیور خاک ہے[9] وہ تو چرخ سے چھن کر دُرِّ پاک ہو کر نمودار ہوا ہے، وہ جانِ جہان ہے، وہ خود سارا عالم ہے، سارا جہان اس کے وجود کا بار برداشت نہیں کر سکتا ہے، وہ ہر دو سرا کا بادشاہ ہے، گنج خدا کی کلید ہے، وہ لڑکوں کا محض کھیل نہیں ہے، اس میں رحمان کی صورت دکھائی دیتی ہے، اگر اس کی غفلتوں سے اس کی انسانیت کا آئینہ زنگ آلود ہو جائے، تو یہ کائنات کے لئے بڑی مصیبت ہے

اے زازل گوہر پاک آمدہ	گوہر تو زیور خاک آمدہ
چنبر ز چرخ لبے بخت خاک	تا تو برون آمدی اے دُرِّ پاک
جان جہاں ہمہ عالم توئی	وانچہ نہ گنجد بہ جان ہم توئی
تو شہ اقلیم ہر دو سرائے	نہ فلکے تختِ تو شد چار پائے
گنج خدا را تو کلید آمدی	نہ از پے بازیچہ پدید آمدی
چرخ کہ از گوہر احسانت ساخت	آئینہ صورت رحمانت ساخت
آئینہ زیں گونہ کہ داری بہ جنگ	آہ ہزار آہ کہ داری بہ زنگ

اس سے بڑھ کر انسان کیلئے اور کون سا دلنواز پیام ہو سکتا ہے، تصوف اسی قسم کی انسانیت کو سنوارا کرتا ہے، اور جب انسان اس قسم کی سنوری ہوئی انسانیت کا حامل ہو جاتا ہے تو خسرو کے خیال کے مطابق وہ کہہ اٹھتا ہے،

نے گلم نے بلبلم نے شمع و نے پروانہ ام

عاشقِ حسنِ خودم بر حسنِ خود دیوانہ ام

تصوف باطنی تعلیمات کے ساتھ صوری اخلاق کی درستگی پر بھی زور دیتا ہے اس لئے امیر خسرو کے یہاں اخلاقی تعلیمات بھی ہیں، وہ اپنے دور کے ہر طبقہ کے لوگوں کے اخلاق حسنہ کے خواہاں رہے، اسی لئے ان کے اخلاق کو درست کرنے کے دردمندانہ پیامات دیتے رہے، مثلاً اپنے زمانہ کے حکمرانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ اپنے اللہ اور رسول کے احکام کے فرماں بردار ہوں، ان کی ہر رائے محکم ہو اور اس پر سختی سے عمل کریں، ہر کام وقت پر عزم و سکون کے ساتھ کریں، غفلت کو راہ نہ دیں، انصاف سے کام لیں، تاکہ چھوٹا بڑا کوئی بھی ظلم کی آواز نہ سنے، خواص و عوام کی آسودگی کا خیال رکھیں تاکہ بیابان کے چلنے والے اور محل کے رہنے والے دونوں یکساں طور پر خوش رہیں، مثنوی نہ سپہر میں کہتے ہیں (ص ۲۹-۲۲۸)

پنج بنا شرط جہاں داری ست	آید از و کش ز خدا یاری ست
اولش آنست کہ در کار تخت	رائے بود محکم و تدبیر سخت
کار گذاراں بشہ کامگار	باز نمایند سر انجام کار
سیومش آنست کہ در حزم خویش	دور کند پردۂ غفلت ز پیش
آنکہ سر خویش ندارد نگاہ	کے سر غیری رہدش در پناہ
چارمش آں شد کہ بانصاف و داد	تازہ کند گلشنِ دین راسواد
تا کو مہ ز اہل خراش و خروش	نشنود آواز تظلم بہ گوش
پنجمش آں شد کہ نماید مدام	جہد در آسودگی خاص و عام
بر ہمہ دارد بہ بیابان و کاخ	جا خوش و رہ ایمن و نعمت فراخ

آنچہ بفہرست رقم یافت چیست   بازنمایم بہ بیاباں درست

امرا کو بھی مخاطب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر ان پر خدا کو خوش رکھنے کا خیال غالب رہے گا، تو وہ اپنے ملک کے بادشاہ کو بھی خوش رکھ سکتے ہیں، حقیقی مالک کی اطاعت گذاری ہی سے دنیاوی مالک کی فرماں برداری آسکتی ہے، (مثنوی نہ سپہر ص ۲۵۱)

اے کہ بہ شغل ملکی و سری   نصیب ز درگاہ شہ کشوری
ہر کہ شود بر سر جمعی بلند   نہ کہ بود از پے دیں بہ پسند
اولش از طاعت یزداں مہی است   زاں پسش از خدمت سلطاں مہی است

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امراء کو بادشاہ ہی سے جاگیر، مال اور رتبہ ملتا ہے، اگر وہ اس کے نیک خواہ نہ ہوں گے تو یہ سب چیزیں ان کے لئے حلال نہ ہوں گی،

شہ کہ ولایت دہد و مال و جاہ   نیست حلال ار نہ بوی نیک خواہ

وہ لشکریوں کو بھی مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ وہ مذہبی ہوں، فرائض و سنن کے پابند ہوں، خدا کے پیام کی فتح و کامرانی کے لئے کوشاں ہوں، غارت گری اور ناموری کے لئے لڑائی نہ لڑتے ہوں، رعایا کی کھیتی نہ برباد کرتے ہوں، خون جگر سے کاشتکار جو خوشے تیار کرتے ہوں، ان کو اپنے گھوڑوں کے پیٹ میں نہ جانے دیں (نہ سپہر ص ۵۷-۲۵۶)

اولش آں باشد کہ بہ نفس صبور   از سنن و فرض نباشند دور
داوا فتد شان بہر خدا صفدری   نے ز پے غارت و نام آوری
درد و دردہ رفق دمادم کنند   واشتلم لشکریاں کم کنند
در تو تاراج بری خرمنے   خرمن تو نیز بود دشمنے
باہمہ نیرو ئی قوی یالگان   کشت رعیت مچراں رائگاں

خوشہ کہ ہندو ز جگر دادہ آب   در جگر اسپ تو نبود صواب

پھر عام لوگوں کے اخلاق کو سنوارنے کے لئے نصیحت کرتے ہیں کہ وہ آبرو شناس اور حلیم ہوں، حلم و سکون ہی میں سیرت کی فرزانگی ہے، خشم و غضب میں دیوانگی ہے، (نہ سپہر ص ۶۵-۲۶۳)

حلم و سکون سیرت فرزانگی است   خشم و غضب مایۂ دیوانگی است

وہ دیانت اختیار کریں کہ اس سے دین بھی سنورتا ہے، خیانت سے ادبار آتا ہے،

دیں ز دیانت شود آراستہ   خاین از ادبار شود کاستہ

حسد، غصہ اور بخیلی بہت بڑی بدی ہے،

ہیچ بدی در دل و جاں بداں   چوں حسد و خشم و بخیلی مداں

امیر خسرو ایک ہندوستانی نوجوان میں جو اوصاف چاہتے تھے، اس کی عکاسی ان کی ان نصیحتوں سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے لڑکے کو دی تھیں (خسرو شیریں ص ۲۹-۳۴)، کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا اطاعت گذار ہو، وہ پاک اعتقاد کا ہو، نیک اور پرہیزگار لوگوں کی صحبت میں رہتا ہو،

نخستیں پندم آں شد گر نیوشی   کہ جز در طاعت یزداں نکوشی
ہمیشہ ز اعتقاد پاک پیوند   خدا را بندہ باشی نفس را بند
بہ صف نیک مرداں شو کماں گیر   ز بدناماں گریزاں باش چو تیر

وہ کہتے کہ ایک نوجوان شیر کی طرح رہے جو اپنے شکار کے ساتھ مست رہتا ہے، سور اور کتے کی طرح حریص نہ رہے،

چوں شیراں در شکار انداز مستی   چو خوک و سگ مکن شہوت پرستی

وہ روشن ضمیر کا مالک بن کر رہے، کوئی کام ایسا نہ کرے جو بوڑھے ناپسند کریں،

بطاعت کوش چوں روشن ضمیراں — مکن کارے کہ نہ پسندند پیراں

وہ ہمیشہ سچ بولے، اگر سچ بولنے میں بھی اس پر تہمت رکھی جائے تو اس کی پرواہ نہ کرے، راست گاری ہی میں اس کی رستگاری ہے،

اگر خواہی نکو باشی نکو باشں — ہمیشہ راست گاری و راست گو باش

مترس از تہمت گو رستگار ست — کہ مرد از راست گاری رستگار ست

ایک روٹی پر صبر کر لینا اصل بادشاہی ہے، خزانہ کے پیچھے دوڑنا گدائی ہے،

بنانے صبر کردن بادشائست — دویدن در پئے گنجے گدائست

وہ اسکو اس بلندی کی تعلیم دیتے ہیں، کہ تخت و تاج کے لئے محتاج رہنا مناسب نہیں، وہ زمین کو اپنا تخت اور چرخ کو اپنا تاج سمجھ کر زندگی گذارے،

مباش از بہرِ تخت و تاج محتاج — زمیں را تخت دان و چرخ را تاج

وہ حاجت مند بن کر دنیا کی کسی چیز کی طلب نہ کرے، اگر تلاش کے بغیر اس کو کوئی چیز مل جائے تو اس کو رد بھی نہ کرے،

ز حاجت ہیچ در دنیا مجو چیز — وگر ناجستہ یابی رد مکن نیز

اور اگر ابر دولت اس پر موتی برسائے تو وہ شاخ گلنار کی طرح اپنی فروتنی میں جھکا رہے،

چو گرد و ابر دولت بر تو دُر بار

فروتن باش، ہمچوں شاخِ گلنار

وہ ہاتھی کی پیشانی کی طرح کشادہ بن کر رہے، چیونٹیوں کی طرح بن کر نہ رہے،

چوں پیلاں باشں پیشانی کشادہ

کہ چون مور کز بر سینہ دادہ

عورتوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شرم و حیا کے ساتھ گھر ہی کی زینت بنی رہیں، جو عورتیں گلی گلی ماری پھرتی ہیں، اُن کے متعلق لکھا ہے، (ہشت بہشت ص ۲۹)

زن کہ در کوچہ ہا بنگ باشد

زن نباشد کہ مادہ سگ باشد

صاحب المثنوی

یہ فارسی زبان کے مشہور صوفی اور مثنوی نگار شاعر، اور فارسی کی سب سے مشہور صوفیانہ مثنوی کے مصنف مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری ہے، جس میں حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اور جس طرح درس و تدریس وعظ و نصیحت، پند و ارشاد کو چھوڑ کر، ان کے عشق میں دیوانہ ہوئے ہیں اس کو اور اُن کی زندگی کے اور بہت سے واقعات کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہ مولانائے جلال الدین رومی پر مولانا شبلی کی سوانح مولانائے روم کے بعد دوسری مستند کتاب ہے، از قاضی تلمذ حسین صاحب

قیمت :-

امام ربیع بن سلیمان مرادی

از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

امام شافعی کے محبوب شاگرد، ان کی بزم علم کے رکن رکین، اور ان کی فقہ کے راوی امام ربیع بن سلیمان مرادی ۱۷۴ھ/۷۹۰ء میں مصر میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی قابل فخر سال ہے، جس میں فقہ شافعی کے دو اور نامور فقیہوں امام مزنی اور امام بحر بن نصر نے اس دنیائے آب وگل میں آنکھیں کھولیں، امام مزنی، امام ربیع مرادی کے رضاعی بھائی اور عمر میں ان سے چھ مہینے بڑے تھے[1]۔

امام ربیع کی مشہور کنیت ابو محمد ہے، سبھی تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ابن ندیم، انھیں ابو سلیمان بھی کہتے ہیں، موذنِ فسطاط اور موذن شافعی کے لقب سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔

ان کا خاندان مدت دراز سے مصر میں آباد تھا، ... وہ قبیلۂ مراد سے تعلق رکھتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ کے اجداد میں یحابر بن مالک بن ادد بن سبا ایک ظالم وتمرد شخص تھا، اس کے تمرد کی وجہ سے اس کا نام ہی مراد پڑ گیا،

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۶، طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۲۶۸

پھر اسی نام سے یہ قبیلہ مشہور ہو گیا، جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں یہ قبیلہ بڑا مردم آفریں رہا ہے، امام ربیع کا تعلق اس قبیلہ سے نسلی اعتبار سے نہ تھا، بلکہ وہ موالاۃ یا حلیف ہونے کی بنا پر مرادی کہلاتے ہیں[1]، ان کے خاندان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ خاصے عرصے یہ لوگ مصر میں بود وباش اختیار کئے ہوئے تھے، اور خالص مصری ہو گئے تھے[2]،

امام ربیع کی نشو ونما اور ابتدائی تعلیم وتربیت کے بارہ میں تاریخ کے صفحات خاموش ہیں، لیکن ان کے اساتذہ میں عبد اللہ بن وہب، عبد اللہ بن یوسف، ایوب بن سوید رملی، یحییٰ بن حسان، اسد بن موسیٰ، بشر بن بکر اور شعیب بن لیث[3] جیسے ممتاز محدثین کے اسمائے گرامی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد ہی علم حدیث سے شغف اور ممتاز محدثین کی مصر میں موجودگی کی کشش نے امام ربیع کی علم جو طبیعت کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ان کے حسن ذوق نے اس زمانہ میں علم کلام کی گرم بازاری سے صرف نظر کر کے علم حدیث کا انتخاب کیا، عبد اللہ بن وہب، امام ربیع کے خاص استاذ تھے، اس تعلق خاص کی وجہ سے بعض حضرات نے امام ربیع کو صاحب ابن وہب بھی کہا ہے[4]، ابن وہب امام مالک اور امام لیث بن سعد کی طرح صف اول کے محدث اور فقیہ ہیں، ابن فرحون کی روایت کے مطابق امام مالک نے ابن وہب کے علاوہ کسی کو کبھی فقیہ نہیں لکھا، ان کے کمال کا یہ حال تھا کہ لاکھوں حدیثوں کے حافظ ہونے کے باوجود ایک بھی منکر حدیث ان سے منقول نہیں، متقی اس درجہ کے تھے کہ قرات حدیث کے دوران قیامت کی ہولناکیوں کے ذکر سے ایسا خوف طاری ہوا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے اور اسی بے ہوشی کے عالم میں چند دنوں بعد اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے[5]،

[1] اللباب، ابن اثیر ج ۳ ص ۱۰۸، تاج العروس ج ۲ ص ۵۰۰، لسان العرب ج ۲ ص ۲۶۴، اس صورت میں مرد سے فعال کے وزن پر مراد ہو گا، [2] تہذیب، ج ۳ ص ۲۴۶، اصلاً من مصر، [3] تہذیب التہذیب، ج ۳ ص ۲۴۶، [4] العبر ج ۲ ص ۴۵، [5] حسن المحاضرہ، سیوطی ص ۱۲۱،

یہ امام ربیع کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں ابن وہب جیسی عالی مرتبت ذات سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا،

ان کے دوسرے نمایاں اساتذہ میں موطا کے راوی عبداللہ بن یوسف تینسی ہیں، جنھیں امام بخاری شامی محدثین میں سب سے زیادہ معتبر قرار دیتے ہیں[1]، بشر بن البکر ہیں جو امام اوزاعی کے شاگرد اور امام شافعی وحیدی کے استاد ہیں، یحییٰ بن حسان ہیں، جو امام مالک و امام لیث کے شاگرد ہیں، ان کے بارہ میں محدثین کی رائے ہے کہ وہ مصر کے جلیل القدر محدث اور مستند امام ہیں، امام ربیع کے اساتذہ کے سلسلۂ زریں میں امام لیث بن سعد کے صاحبزادے اور ممتاز فقیہ و مفتی شعیب بن لیث اور مشہور اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پر پوتے، امام حدیث اسد بن موسیٰ کے اسماء جلیلہ بھی نمایاں ہیں[2]،

امام ربیع کے ان اساتذہ کی نمایاں خصوصیت، علوم حدیث و فقہ کی جامعیت ہے، اس سے امام ربیع کے ذوق انتخاب پر روشنی پڑنے کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع ہی سے ایک مقصد پیش نظر رکھتے تھے،

حدیث و فقہ کی اس جامعیت نے جس میں حدیث کا رنگ غالب تھا، امام ربیع کے فکر و شعور میں ایسے رجحانات پیدا کئے جو انھیں امام شافعی کے مکتب فکر سے قریب لانے اور ان کے طرز استدلال و اجتہاد کو قبول کرنے میں زیادہ معاون و ساز گار ثابت ہوئے،

امام شافعی مصر ۱۹۸-۱۹۹ھ میں تشریف لائے[3]، اس وقت امام ربیع کی عمر تقریباً ۲۵ برس کی تھی، اور اس عمر میں وہ کبار محدثین و فقہاء سے اکتساب علم، خاصی حد تک کر چکے تھے، علمی ذوق کی پختگی کی وجہ سے فقہ شافعی سے انھیں کافی مناسبت ہو گئی، امام شافعی کے علم، تقویٰ اور تفقہ کی شہرت و قبولیت سے متاثر ہو کر وہ دوسرے نو عمر ساتھیوں کی طرح امام شافعی

[1] حسن المحاضرہ، سیوطی ص ۱۴۵، [2] الیفاً ج ۱ ص ۱۴۵، [3] وفیات ۱۔ ابن خلکان ج ۲، ص ۲۱۶،

کی خدمت میں حاضر ہوئے، امام شافعی کو قاسم ازل نے اور نعمتوں کے ساتھ صالح اور ذہین شاگردوں کی نعمت خاص ایسی عطا فرمائی تھی کہ باید و شاید، ان کا ہر شاگرد علم عمیق، ذہن ثاقب اور صلاح و تقویٰ میں ممتاز تھا، ان کے مصری تلامذہ میں ابو یعلی کے سوا سب نوجوان اور تقریباً ہم عمر تھے، اور یہی لوگ ہیں جو جدید فقہ شافعی کے حامل و ناقل ہیں[1]،

امام ربیع نے، امام شافعی سے باضابطہ فیض تو مصر میں حاصل کیا، لیکن بعض روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ مصر میں ان کی آمد سے پہلے ہی بغداد میں ان سے مستفید ہو چکے تھے، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ امام شافعی نے ان سے بغداد میں اہل مصر کے دینی و فقہی رجحانات کے بارہ میں سوال کیا تو انھوں نے عرض کیا کہ وہاں دو طبقے ہیں، ایک تو امام ابو حنیفہ کے مسلک سے قریب تر ہے، اور دوسرا طبقہ اس کے برعکس امام مالک کی آراء و افکار سے متاثر ہے، امام شافعی نے یہ سن کر فرمایا، میں ان کے سامنے ایسا نقطۂ نظر پیش کر دوں گا، جو انھیں ان دونوں سے بے نیاز کر دے گا[2]،

ارجوان اقدم مصر ان شاء	مجھے امید ہے کہ جب مصر آؤں گا تو ان کے
الله فآتيهم بشئ اشغلهم	سامنے ایسی چیز پیش کروں گا جو انھیں
به عن القولين جميعا ،	دونوں سے بے نیاز کر دے گی،

امام شافعی کے اس دعویٰ کی تائید میں امام ربیع فرماتے ہیں کہ پھر ایسا ہی ہوا[3]، مصر آنے سے قبل امام شافعی چند مہینوں کے لئے بغداد سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، اس سفر میں امام ربیع بھی ان کے ہمرکاب رہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم مکہ سے منیٰ کی جانب نکلے، راستہ میں جب کوئی وادی اور گھاٹی ملتی تو امام شافعی ان اشعار سے حدی خوانی کرتے[4]،

[1] طبقات الفقہاء، شیرازی ص ۹، ۸۰، [2] معجم المصنفین ص ۲۹۸، [3] توالی التاسیس، ص ۷۷، [4] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۱۵۸،

یا راکبا قف بالمحصب من منی
واھتف بقاعد خیفھا والناھض

سحرا اذا فاض الحجیج الی منی
فیضا کملتطم الفرات الفائض

ان کان رفضا حب آل محمد
فلیشھد الثقلان انی رافض

"اے ہمراہیو! منی و محصب کے نشیب و فراز میں رکو، صبح کے وقت جب حاجی منیٰ کی جانب بڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دریائے فرات موج در موج بہتا جا رہا ہے، اگر آل محمدؐ کی محبت کا نام رفض ہے تو سب گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں"۔

مصر میں امام ربیع، امام شافعی کے سایہ کی طرح ان کے رفیق و قریب رہے، امام شافعی کی محبوبیت و دلنوازی نے امام ربیع کو جذبۂ اخلاص و عقیدت سے سرشار کر رکھا تھا، ان کی یہ عقیدت امام شافعی کی ہر خدمت کے لئے ان کو تیار رکھتی تھی، امام شافعی ان کی خدمتوں کے معترف تھے فرماتے تھے، میری جتنی خدمت ربیع نے کی، اتنی کسی اور نے نہیں کی[1]، اسی بے لوث خدمت نے ان کو مقام محبوبیت پر فائز کیا، امام شافعی کے بے شمار شاگردوں میں وہ تنہا ہیں جنھیں "محبوب شافعی" کا لقب ملا، امام شافعی غایت درجہ شفقت سے ان سے فرماتے "تم مجھے کتنے محبوب ہو"[2]، بلا شبہ محبت کی یہ سند ایسی ہے جو ان کے لئے باعث شکر و امتنان اور سرمایۂ فخر و ناز ہے۔

محبت اور اپنائیت کا ایک اور واقعہ لائق ذکر ہے، ایک بار امام شافعی نے ایک دعوت کا اہتمام کیا، لوگ فارغ ہو گئے تو امام بویطی نے امام ربیع سے کہا، چلو اب ہم بھی فارغ ہو لیں، امام ربیع نے جواب دیا ہمیں کھانے کی اجازت کس نے دی؟ امام شافعی نے یہ بات سنی تو فرمایا، سبحان اللہ! انت فی حل من مالی کلہ، تمہیں تو میرے سارے مال میں اختیار ہے،

ایسے ہی ایک موقع پر جب امام ربیع نے بازار سے سامان لا کر حساب پیش کرنا چاہا تو امام شافعی

---

[1] وفیات، ابن خلکان ص ۳۲۶، تہذیب الاسماء، نووی ص ۱۸۸،

نے فرمایا، وقت مت ضائع کرو، میں تم سے حساب نہیں مانگتا، امام ربیع نے عرض کیا کہ ام ابی الحسن (حرم امام شافعی) تو حساب مانگتی ہیں، اس پر امام شافعی نے فرمایا[1]،

یا طویل الرقاد انت فی حل من مالی کلہ،
ارے نیند کے ماتے، تمہیں تو میرے سارے مال میں اختیار ہے،

امام ربیع کی شادی ہوئی تو امام شافعی نے دریافت فرمایا کہ مہر کتنا مقرر ہوا، جواب دیا تیس دینار، امام شافعی نے پھر پوچھا کہ کتنا ادا کیا، انھوں نے کہا، چھ دینار، یہ سن کر امام شافعی گھر تشریف لے گئے، وہاں سے ایک تھیلی بھیجی جس میں چوبیس[2] دینار موجود تھے[3]،

امام ربیع کو اپنے عالی مرتبت استاد کے صرف مال ہی میں نہیں، علم کے حصول میں بھی اختیار کلی حاصل تھا، ایک موقع پر امام شافعی نے فرمایا، اے ربیع، اگر علم کھلانے والی چیز ہوتی تو میں تمہیں اسے کھلا کر رہتا[4]، اس قول سے بعض لوگوں کو ان کے بطئ الفہم ہونے کا شبہ ہوا، قفال مروزی نے اپنے فتاویٰ میں اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے، لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ امام شافعی ان کی صلاحیت اخذ، حسن فہم اور نافعیت کی بناء پر یہ خواہش کرتے تھے، کہ انھیں گویا علم کھلا دیا جائے[5]، ابن خلکان کی ایک روایت سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، وہ امام ربیع کے بارہ میں امام شافعی کا یہ قول نقل کرتے ہیں،

اماد اللہ ما فی القوم انفع
لی منہ ولوددت انی حشوتہ
العلم حشوا،

بخدا لوگوں میں ان سے (ربیع) زیادہ میرے لئے اور کوئی مفید نہیں، میں چاہتا ہوں کہ انھیں علم سے بھر دوں[6]

امام ربیع کے حفظ و اتقان کی صلاحیت ہی کی وجہ سے امام شافعی فرمایا کرتے تھے، کہ الربیع

---

[1] معجم المصنفین ص ۲۹۳، [2] انتقاء، ابن عبد البر ص ۹۴، [3] وفیات، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۶

[4] مرآۃ الجنان، یافعی ج ۲، ص ۱۱۴، [5] وفیات الاعیان، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۷،

فرطِ محبت و عقیدت سے کبھی امام شافعی کی جائے نشست پر نہیں بیٹھے، امام شافعی قبلہ رخ تشریف رکھتے تھے، لیکن امام ربیع کی پشت جانب قبلہ رہتی تھی، اس طرح گویا وہ عالم تصور میں امام شافعی کے روبرو ہوتے تھے،[1]

کچھ عرصہ بعد جب مصر کے علم پرور، حوصلہ مند اور نامور امیر احمد بن طولون نے ایک عظیم الشان مسجد جامع ابن طولون تعمیر کی تو اہل علم و فضل سے اس مسجد کو آباد کرنے کی درخواست کی، چنانچہ قاضی بکار نے اس میں سب سے پہلے نماز پڑھائی، ابو یعقوب بلخی نے خطبہ دیا، اور امام ربیع نے اس میں درس کے ساتھ حدیث کا املا کرایا، انھوں نے مسجد کے لئے ایک خوبصورت تختی بھی تیار کرائی جس میں حدیث کے یہ الفاظ نقش تھے،[2]

من بنى لله مسجدا ولو كمفحص قطاة بنى الله له بيتا فى الجنة ،

جو اللہ کے لئے مسجد بنائے گا، خواہ وہ بلیوں کے گھروندوں جیسی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لئے ایک گھر بنائے گا،

اس موقع پر ابن طولون نے امام ربیع کی خدمت میں ایک کیسۂ زر پیش کیا، جس میں ایک ہزار سرخ دینار تھے،

وقت کے ساتھ ساتھ امام ربیع کا حلقۂ درس اور ان کی شہرت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، امام مزنی اپنی تالیفات سے اور امام ربیع اپنے درس سے فقہ شافعی کی ترویج میں روز افزوں اضافہ کرنے لگے، امام نووی فرماتے ہیں کہ،

صارت الیه الرحال تشد

لوگ دور دور سے، امام شافعی کی کتابوں

---

[1] توالی التاسیس، عسقلانی ص ۸۴، [2] حسن المحاضرہ: سیوطی ص ۱۳۶،

الیه من اقطار الارض لسماع کتب الشافعی[1]

کی سماعت کے لئے ان کے پاس کاروان در کاروان آنے لگے،

محمد بن احمد طرائفی بغدادی کا بیان ہے کہ ایک روز ہم امام ربیع کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے دروازے پر تقریباً نو سو مسافر ایسے تھے جو دور دور سے امام شافعی کی کتابوں کی سماعت کے لئے آئے ہوئے تھے،[2]

امام بیہقی کی روایت ہے کہ سنہ ۲۴۰ھ میں امام ربیع نے حج کیا، وہیں ان کی ملاقات امام شافعی کے ایک اور ممتاز عراقی شاگرد اور ان کی فقہ قدیم کے سب سے بڑے راوی امام زعفرانی سے ہوئی، اثنائے گفتگو میں امام ربیع نے فرمایا، اے ابوعلی (زعفرانی) تم مشرق میں اور میں مغرب میں اس علم (علم شافعی) کو عام کر کے رہیں گے،[3] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبوب استاد کے علم کو عام کرنے میں وہ کس قدر سنجیدہ پرجوش اور مخلص تھے، امام سبکی کے الفاظ میں امام ربیع کے شاگردوں کی کثرت سے امام شافعی کے اس قول کی صداقت کہ میرے راوی تو ربیع ہیں، اظہر من الشمس ہے،[4]

(باقی)

---

[1] تہذیب الاسماء، نووی ص ۱۸۰، تاریخ التشریع الاسلامی: حضرمی ص ۲۶۱، [2] تہذیب الاسماء: نووی ج ۱ ص ۱۸۴ [3] ایضاً ص ۱۸۸، ۱۸۹، [4] طبقات: ج ۱ ص ۲۵۹،

ادبیات

غزل

از جناب بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ، رکاب گنج لکھنؤ

مرادرِ عشق بھی خوب ہے، ہے عجیب کچھ مری داستاں
کوئی خار جیسے چبھا چبھا، نہ نہاں نہاں نہ عیاں عیاں
کئی دن سے ہیں وہ خفا خفا کئی دن سے ہیں وہ کشاں کشاں
کوئی شمع جیسے بجھی بجھی، کوئی شام جیسے دھواں دھواں
یہ ادائے گیسوئے عنبریں کہ ہو چھائی جیسے گھٹا کہیں
یہ خرامِ نازک و دلنشیں، یہ نسیمِ صبح رواں دواں
وہ ادائے حسن سخن کہ ہم جو سنیں تو بھول لیں جہاں کے غم
وہ نگاہ ملتفت و کرم جو بنی پیامِ نشاطِ جاں
ملے خلد بھی تو نہ لیں گے ہم، کوئی کچھ کہے نہ سنیں گے ہم
ہمیں ہیں عزیز تو ایک وہ، نہ تو ماہ و گل نہ کہکشاں
کبھی عشرتوں میں جہاں کے ہم گئے بھول تیرے غم و الم
کبھی تیری زلفوں کے پیچ و خم نے بھلا دیے غمِ دو جہاں
وہ جمالِ حسنِ مجاز تھا کہ خیالِ زلفِ دراز تھا
کوئی سوز نغمۂ ساز تھا، کبھی تھا کوئی مرا رازداں
وہ پیامِ حسنِ بتاں سہی، وہ حکایتِ دل و جاں سہی
وہ یقیں سہی کہ گماں سہی، میرا ذوق گم تھا کہاں کہاں
نہ وہ خضرِ راہ کی رہبری نہ ایاز ہے نہ وہ غزنوی
نہ وہ کیف ہے نہ وہ زندگی، نہ وہ دل رہا نہ وہ دلستاں
انھیں جانِ درد و حِ چمن کہیں کہ بسنت حسن سخن کہیں
انھیں کیسے وعدہ شکن کہیں، نہیں ہے ان کی نہ انکی ہاں

مطبوعاتِ جدیدہ

بوارق الغیب - از مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت عمدہ، صفحات ۲۸۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳/۰ روپئے۔
پتہ: الفرقان بکڈپو، ۳۱- نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ۔

ماضی قریب میں جو مسائل مسلمانوں کے درمیان مابہ النزاع اور انکی تحریر و تقریر اور بحث و مناظرہ کا خاص موضوع رہے ہیں، ان میں ایک علم غیب کا مسئلہ بھی ہے، اس کی تائید و تردید میں متعدد کتابیں اور رسالے لکھے گئے ہیں، ایک زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان کو بھی ان بحثوں سے بہت دلچسپی تھی، زیر نظر کتاب ان کے اسی دور کی یادگار ہے، لیکن اب نہ مولانا کا یہ ذوق ہی رہا اور نہ وہ اس طرح کی بحثوں کو مفید سمجھتے ہیں، مگر ادھر کئی برسوں سے ان فرسودہ بحثوں کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، جن سے عام مسلمانوں میں انتشار و افتراق بڑھتا جا رہا ہے اس لیے مولانا کو اپنے عزیزوں اور احباب کے اصرار خواہش پر اس نایاب اور پرانی کتاب کو دوبارہ شائع کرنے کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔ اس کے دو حصے ہیں، ابھی صرف پہلا حصہ شائع ہوا ہے، اس میں قرآن پاک کی ایسی چالیس۴۰ آیتیں نقل کر کے ان کی تشریح ترجمہ کے ساتھ کی گئی ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ غیب کا علم صرف خدائے تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، مولانا نے یہ احتیاط بھی کی ہے کہ آیتوں کے متعلق

اپنا خیال اور نقطۂ نظر نہیں پیش کیا بلکہ پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی اور شاہ عبد القادرؒ کے اردو ترجمے نقل کیے ہیں، پھر آیتوں کے مفہوم کی وضاحت کے لیے دوسرے قرآنی نظائر یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابہ کرامؓ کے اقوال پیش کئے ہیں اور مزید توضیح و تائید کے لیے تابعین عظام اور کبار مفسرین کی رائیں نقل کی ہیں، آخر میں ان آیتوں کی غلط تاویل و توجیہ کرنے والوں کے شبہات کا ازالہ کیا ہے، اس طرح یہ کتاب بہت مدلل ہے، اور اس سے غیر اللہ کے لیے علم غیب ثابت کرنے والوں کی مکمل تردید ہوگئی ہے، لیکن یہ مولانا کے ابتدائی اور مناظرانہ دور کی تصنیف ہے اس لیے اس میں یہی رنگ نمایاں ہے، مولانا نے جس مقصد اور جذبے یہ کتاب اب دوبارہ شائع کی ہے امید کہ اس کی قدر کیجائے گی، آخر مسلمان کب تک باہم سرگریباں رہ کر اپنی صلاحیت اور قوت ضائع کرتے رہیں گے؟

قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ - از مولانا عبد الحق صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۰۔ قیمت تحریر نہیں، ناشر موتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ، خٹک (پشاور) پاکستان۔

شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا اصل میدان درس و تدریس اور علم دین کی خدمت و اشاعت ہے، دار العلوم حقانیہ کا قیام انہی کا کارنامہ ہے، جس کو پاکستان میں دار العلوم دیوبند کا مثنیٰ خیال کیا جاتا ہے، ان مفید خدمات کے ساتھ وہ ملک و ملت کی اصلاح، پاکستان میں صالح معاشرہ اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے بھی برابر جد و جہد کرتے رہتے ہیں، پاکستان کے گذشتہ عام انتخابات کے بعد جب وہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا اور بچے کھچے حصہ کی قیادت و سربراہی ذو الفقار علی بھٹو

کے حصہ میں آئی تو اس زمانہ میں وہ بھی جمعیۃ علمائے اسلام کے ٹکٹ پر پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے، اپنی رکنیت کے زمانہ میں انھوں نے قومی اسمبلی میں جو تقریریں کیں اور پاکستان کے آئین و دستور میں اصلاح و ترمیم کے لیے جو سفارشیں اور تجویزیں پیش کیں ان کا ایک حصہ اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے، مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا اسلئے یہاں اسلام ہی کا بول بالا ہو اور ان ساری چیزوں کو ختم ہونا چاہیے جو اسلام اور نظریۂ پاکستان کے منافی ہیں، اس مقصد سے انھوں نے قومی اسمبلی میں شراب، جوا، رقص، سرود، عریاں فلموں، فحش ثقافتی سرگرمیوں، ملحدانہ اور لادینی لٹریچر اور دوسرے منکرات کے انسداد کی تجویزیں پیش کی تھیں اور سوشلزم کے بجائے اسلام کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے اور اوقاف، صدقات و زکوٰۃ کی بہتر تنظیم کرنے پر زور دیا ہے، اسی طرح نصابِ تعلیم میں اصلاح، عربی زبان کو فروغ دینے، اسلام کے عائلی قوانین اور دوسرے احکام میں رد و بدل نہ کرنے، اسلامی آئین نافذ کرنے، قوم کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل اور عام لوگوں کی مشکلات حل کرنے کے بارہ میں بھی سفارشات پیش کی ہیں اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغ و اشاعت پر پابندی عائد کرنے اور اس زمانہ کے حالات کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ مولانا کی تجویزوں کی تائید و تردید میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے، گو مولانا کی یہ تجویزیں رد کردی گئیں اور بعض کو پیش کرنے کا بھی موقع نہیں دیا گیا، تاہم ان سے جہاں مولانا اور ان کے ہم خیال لوگوں کی دینی حمیت اور ملی غیرت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں پاکستان کے عام ذہنی رجحانات، خصوصاً اس زمانہ کے برسر اقتدار طبقہ کے مذہب بیزار اور اسلامی نظام کے بارہ میں لیت و لعل کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اردو کے مسائل - مرتبہ ڈاکٹر حکم چند نیر، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۹۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت بارہ ۱۲ روپئے - پتے :-
(۱) شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی (۲) ادارۂ فروغ اردو، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

زیر نظر کتاب بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر حکم چند نیر کے چھ مضامین کا مجموعہ ہے، شروع کے چار مضامین میں ہندوستان کی گذشتہ سیاسی وسماجی تاریخ بیان کی گئی ہے، اس کا مقصد انگریزوں کی اس حکمت عملی اور سازش کو بے نقاب کرنا ہے جو انھوں نے سیاسی مفاد اور ہندوستان پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے کی تھی، جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے لسانی، سماجی اور تہذیبی اتحاد کو ختم کرنے اور قومی سالمیت کو پاش پاش کرنے کے لیے عدالتوں اور دفتروں سے فارسی کے اخراج، ہندی واردو زبان اور فارسی، دیوناگری اور رومن رسم خط کے جھگڑے، اوپری سطح کے لیے انگریزی اور نیچے کی سطح کے لیے تعلیمی اور سرکاری حیثیت سے مختلف علاقائی زبانوں کے رواج، اردو کے ساتھ دیوناگری کو عدالتی اور سرکاری رسم خط بنانے کے فیصلہ وغیرہ پر بڑی مفید بحث کی ہے، ایک مضمون ہندی روزنامہ بھارت (الہ آباد) کے سوالات کا جواب ہے، اس میں دلائل کے ساتھ مذہب سے زبان کے تعلق کی نفی کی ہے اور اردو کو ایک جمہوری زبان بتایا ہے، جو مختلف النسل، مختلف المذاہب اور مختلف اللسان لوگوں کے باہمی ارتباط واختلاط سے ہندوستان میں پیدا ہوئی اور کہیں باہر سے نہیں آئی، اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ عربی وفارسی الفاظ ترک کرنے کے بعد اردو کا اچھا اور بلند پایہ ادب وجود میں نہیں آسکتا، رسم الخط اور زبان کا تعلق جسم وجان کی طرح ہے، اس کے بغیر زبان باقی نہیں رہ سکتی، ان کے نزدیک اردو کے لیے دیوناگری

رسم الخط کی تجویز مہمل ہے۔ آخری مضمون میں اردو تعلیم کے مسائل پر گفتگو کی ہے، اس میں اردو کی ابتدائی تعلیم پر اس کے بقاء، ترویج وترقی کا دارومدار بتایا ہے، جس پر بقول ان کے آزادی کے بعد سب سے پہلا اور کاری وار کیا گیا، ان کے خیال میں قومی حکومتوں کے بجائے سامراجی حکومتیں مادری زبان کی تعلیم سے محروم کرنے کا طرز عمل اختیار کرتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کا مسئلہ اردو بورڈ اور بعض صوبوں میں اردو اکیڈمیاں قائم کرنے یا سہ لسانی یا دس اور چالیس کے فارمولوں سے حل نہیں ہو سکتا بلکہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے سے حل ہوگا اور اس سے ہندی کی اہمیت کم نہ ہوگی، مصنف نے بنیادی وثانوی تعلیم کے لیے درسی کتابوں کی اہمیت اور ان کو جدید طرز پر مرتب کرنے کی ضرورت بھی واضح کی ہے اور اس بارہ میں مفید مشورے دیے ہیں، امید ہے کہ یہ مضامین علمی حلقے میں دلچسپی سے پڑھے جائیں گے، اور جو آواز ڈاکٹر حکم چند نیر نے بلند کی ہے وہ ہر گوشہ میں بلند کی جائے گی، یہ مضامین اردو کو جائز حقوق دلانے میں موثر ثابت ہوں گے۔

نوائے سحر - از جناب سحر اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۴۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ روپئے، پتہ: سحر کلینک بلتھرا روڈ ضلع بلیا - یو - پی

ڈاکٹر مقبول احمد سحر اعظمی ایک کہنہ سال شاعر اور حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں، "نوائے سحر" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، اس مجموعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے اور نظم کی طرح غزل کو بھی انھوں نے زندگی کے موجودہ مسائل وحقائق اور عہد حاضر کے حالات ورجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، گو سحر صاحب کے کلام میں اس دور کی شدتوں، تلخیوں اور بے راہ روی کا ذکر ہے لیکن ان کا عزم وحوصلہ بلند ہے اس لیے وہ موانع ومشکلات کے باوجود مایوس اور ہراساں نظر نہیں آتے، امید ہے کہ انکے کلام کی پختگی اور زبان وبیان کی دلکشی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرے گی۔

العلم والعلماء ۔ مرتبہ مولانا عبد الرؤف رحمانی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۴، قیمت دو روپیے، پتہ ازمصنف پوسٹ ومقام ڈھنی بازار ضلع بستی۔

اس میں تاریخ وتذکرہ کی مستند کتابوں سے علمائے سلف کے علمی شوق وانہماک، ذوق مطالعہ، طلب علم کے لئے محنت ومشقت، اساتذہ کے احترام اور طلبہ کی ہمت افزائی، شاہان اسلام کی علم دوستی اور علماء نوازی کے ایسے موثر اور سبق آموز واقعات جمع کئے گئے ہیں جن سے علم کی عظمت واہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اور اس کی طلب وجستجو کا داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے، یہ کتابچہ اس زمانے کے تن آسان علماء اور سہولت پسند طلبہ کے لیے عبرت خیز ہے۔

التوحید ۔ مترجمہ مولانا مختار احمد ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۲۵، قیمت تحریر نہیں، پتہ: الدار السلفیہ حامد بلڈنگ، مومن پورہ، مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۱۱

الدار السلفیہ بمبئی نے اصلاحی ودینی کتابوں کی اشاعت کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس سے پہلے معارف میں اس کی بعض مطبوعات کا ذکر آچکا ہے زیر نظر رسالہ قاضی قطر شیخ احمد بن حجر آل بوطامی کی تصنیف "تطہیر الجنان والارکان عن درن الشرک والکفران" کا عام فہم اردو ترجمہ ہے، اس میں توحید کا مفہوم اور اس کی قسمیں بیان کرکے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی دعا، عبادت اور استعانت صرف اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیئے، اس ضمن میں اسلام کے عقیدۂ توحید کے منافی ان اعمال واشغال کا ذکر بھی آگیا ہے جو اس وقت مسلمانوں میں رائج ہیں۔

"ض"

جلد ۱۲۴ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۹ء عدد ۵

مضامین